پارکنگ ایریا

(افسانوں کا مجموعہ)

غضنفر

پارکنگ ایریا

پارکنگ ایریا

(افسانوں کا مجموعہ)

HaSnain Sialvi

غضنفر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

© جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

Parking Area

(Collection of Short Stories)

by

Ghazanfar

Year of Edition 2015
ISBN 978-93-5073-759-0

₹ 129/-

نام کتاب : پارکنگ ایریا (افسانوں کا مجموعہ)
مصنف وناشر : غضنفر
سنِ اشاعت : ۲۰۱۵ء
قیمت : ۱۲۹ روپے
تعداد : ۵۰۰
کمپوزنگ : راغب علی جمالی
مطبع : عفیف پرنٹرس، دہلی۔۶

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

HaSnain Sialvi

کہانی کی کہانی

میں پھر دہراتا ہوں
کہ کہانی صرف کہانی نہیں ہوتی
یہ سوز بھی ہوتی ہے
اور ساز بھی
راز بھی ہوتی ہے
اور ہم راز بھی
آواز بھی ہوتی ہے
اور دم ساز بھی
رمز بھی ہوتی ہے
اور غمّاز بھی
نبض بھی
نبّاض بھی
اور بے نیاز بھی
کہانی سکوتِ جاں کاہ بھی ہوتی ہے
اور صدائے سحر ساز و دل نواز بھی
کہانی وہ بھی کہتی ہے
جو کہا نہیں گیا

وہ بھی سناتی ہے
جو سنا نہیں گیا
وہ بھی دکھاتی ہے
جو دیکھا نہیں گیا
آج کہانی کی اس لیے بھی ضرورت ہے کہ
نیچے سے اوپر تک
ہمارے کانوں میں ایک ایسا میل جم گیا ہے
جسے صرف کہانی توڑ سکتی ہے
وہی منجمد سماعت میں راستہ بنا سکتی ہے

HaSnain Sialvi

فہرست

-1	سرسوتی اسنان	09
-2	اُتّم چندوالیہ	33
-3	مہارشی دو ھیچی	47
-4	محبت کے رنگ	54
-5	آبیاژہ	63
-6	دردکی کی کا کرب	75
-7	حکایتیں اور کہانی	86
-8	پارکنگ ایریا	91
-9	تصویر تختِ سلیمانی	111
-10	بالکونی میں کیکٹس	121
-11	ایک اور منتھن	133
-12	ایک بڑا کھیل	151
-13	حکمت	158
-14	میسیج الرٹ ٹون	168
-15	ڈگڈگی	181

پارکنگ ایریا

-16	بھیڑ	188
-17	سائیبر اسپیس	193
-18	سانڈ	209
-19	ہاؤس ہوسٹس	216
-20	ہسنگ مین	224
○	سوانحی کوائف	230

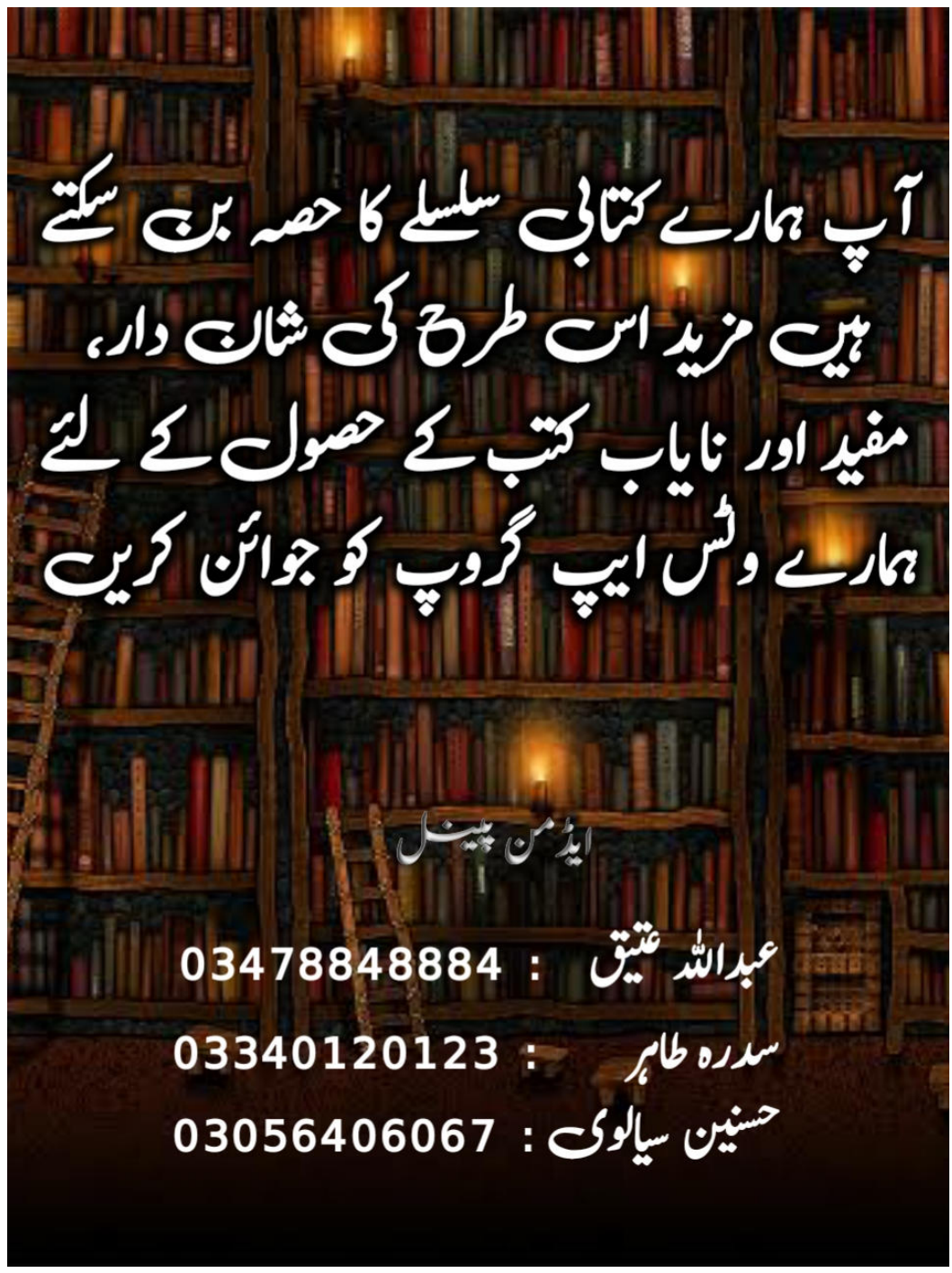

HaSnain Sialvi

سرسوتی اسنان

بھائی صاحب !الہ آباد تک آیا ہوں تو سوچتا ہوں کہ سنگم بھی ہو آؤں۔

''سنگم جاؤ گے؟'' رگھورائے سنگھ اے۔ جے۔ آر کو گھورنے لگے۔

''میں کسی آستھا یا پونیہ کی وجہ سے نہیں جانا چاہتا ہوں۔''

''تو پھر؟''

بھائی صاحب !سنگم ایک تیرتھ استھان ہی نہیں، وہ اور بھی بہت کچھ ہے۔''

''جیسے؟''

''جیسے وہ ایک متھ ہے۔ ایک مسٹری ہے۔ وہاں کے واتاورن میں رہسیہ ہے۔ سسپینس ہے۔ تھرل ہے۔''

''تو یہ بات ہے! میں بھی تو سوچوں کہ مسٹر اے۔ جے۔ آر، شری اے جے جسونت رائے کب سے ہو گئے؟ کب جانا چاہتے ہو؟''

''جب آپ انتظام کر دیں۔''

ابھی چلے جاؤ! اس وقت گاڑی خالی ہے۔ میں ڈرائیور کو بول دیتا ہوں۔''

''شکریہ''

''اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے بھائی؟ تم میرے بھائی ہو۔ اس وقت مہمان بھی ہو۔ تمھاری خاطر کرنا تو ہمارا فرض بنتا ہے۔''

''ٹھیک ہے تو میں اپنا شکریہ واپس لیتا ہوں۔''

''بالکل لو، اور ہاں سنو! جاتے وقت ایک جوڑا نہانے کا کپڑا بھی رکھ لینا۔ وہاں جانے کے بعد اگر تمھاری انتر آتما نے جوش مارا تو وقت نہیں ہوگی۔''

''اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ پھر بھی رکھ لوں گا۔ بڑے بھائی کا حکم جو ٹھہرا اور وہ بھی آپ جیسے بھائی کا۔۔۔'' ٹھیک، ٹھیک ہے۔ بہت ہوگیا۔ کچھ اور چاہیے تو بول دینا۔ سنکوچ مت کرنا۔''

''جی، ضرور۔''

راگھورائے کی جیپ ان کے مہمان اے۔ جے۔ آر کو لے کر سنگم کی طرف روانہ ہوگئی۔ جیپ سے اتر کر سنگم کے کنارے پہنچتے ہی ملاحوں کی ایک ٹولی اے۔ جے۔ آر کے پاس آدھمکی۔

''ایک سواری کے پچاس، پوری ناؤ کے پانچ سو۔''

''پوری ناؤ کے ساڑھے چار سو۔''

''کیول چار سو۔''

ملاح اپنی اپنی کشتی کے ریٹ بتانے لگے۔

''تم نے نہیں بتایا؟'' اے۔ جے۔ آر نے اس سنجیدہ اور قدرے معمر شخص کو مخاطب کیا جو ابھی تک خاموش تھا۔

''ایک ہزار۔'' خاموشی ٹوٹی تو آواز اے۔ جے۔ آر کے کانوں میں گونج پڑی۔

''ایک ہزار! اتنا فرق! تمھاری ناؤ کیا سونے کی بنی ہوئی ہے؟'' ریٹ کی گونج نے اے۔ جے۔ آر کو حیرت میں ڈال دیا۔ ان کی نگاہیں ملاح کی چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔

''بنی تو ہے لکڑی کی ہی صاحب! اور دوسروں سے الگ بھی نہیں ہے پر میں الگ ہوں۔''

''مطلب؟'' اے۔ جے۔ آر کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''مطلب یہ کہ میں کیول ملاح نہیں ہوں۔''ملاح کا چہرہ اور سنجیدہ ہو گیا۔

''ملاح نہیں ہو تو اور کیا ہو بھائی؟'' اے۔ جے۔ آر کی دلچسپی اس ملاح میں بڑھنے لگی۔

''میں کچھ اور بھی ہوں صاحب! آپ جب میری ناؤ میں بیٹھیں گے تو خود جان جائیں گے۔''

ملاح کا یہ اعتماد اے۔ جے۔ آر کو لہجے کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کے ہاؤ بھاؤ سے بھی محسوس ہوا۔

کم ریٹ والے ملاح پُر امید تھے کہ یہ نیا یاتری ان میں سے ہی کسی کی ناؤ پر سوار ہوگا مگر اے۔ جے۔ آر کی نگاہیں تو اس ملاح کی جانب مرکوز ہو چکی تھیں جس کا ریٹ سب سے زیادہ تھا۔ وہ مہنگا ملاح بی اے۔ جے۔ آر کو حیرت سے تک رہا تھا۔

''لگتا ہے مجھے تمھاری ہی ناؤ میں بیٹھنا پڑے گا؟'' اے۔ جے۔ آر نے اس مہنگے ملاح کو مخاطب کیا۔

''آپ کا انداز تو یہی بتا رہا ہے صاحب!'' ملاح نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

''تمھیں اپنے اوپر بڑا اعتماد ہے؟

''سنگم کے اس گھاٹ پر ہونے والی پوجا پاٹ، یہاں آنے والے طرح طرح کے یاتری، یاتریوں کے ہاؤ بھاؤ، اچار وچار، ان کے ویوہار اور باپ دادا کی ٹریننگ نے اتنا کچھ سکھا دیا ہے صاحب کہ آدمی کو دیکھ کر ہی اس کے ارادے کا پتا چل جاتا ہے۔''

''تم واقعی الگ معلوم ہو رہے ہو، میرا ارادہ تمھاری ہی ناؤ پر بیٹھنے کا ہے مگر میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ تمھارا ریٹ اتنا ہائی کیوں ہے؟''

''میں نے بتایا نا صاحب کہ جب آپ میری ناؤ میں بیٹھیں گے تو آپ کو خود بخود

پتا چل جائے گا۔ پھر بھی آپ چاہتے ہیں کہ سوار ہونے سے پہلے ہی بتادوں تو میں ضرور بتاؤں گا پر نتو اس سے پہلے ایک سوال میں بھی آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''پوچھو۔''

''کیا آپ کہیں باہر سے آئے ہیں؟ میرا مطلب ہے انڈیا کے باہر سے؟''

''تم نے یہ سوال کیوں کیا؟ کیا میں باہری لگتا ہوں؟''

''لگتے تو نہیں ہیں پر نتو آپ رہتے باہر ضرور ہونگے۔''

''تم نے کیسے جانا؟''

''کہاں، یہاں کا ہوتا، میرا مطلب ہے یہاں رہ رہا ہوتا تو میرا ریٹ سن کر میری اور دھیان نہیں دیتا بلکہ فوراً اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیتا اور اگر دھیان دیتا بھی تو حیلہ حجت اور بھاؤ تاؤ ضرور کرتا۔''

''تم سچ مچ دوسروں سے الگ ہو۔ چلو، کدھر ہے تمھاری ناؤ؟''

''صاحب! میرا ریٹ اتنا زیادہ کیوں ہے یہ نہیں جانیں گے؟''

''نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کدھر چلنا ہے؟''

''پھر بھی میں ایک بات تو بتا ہی دوں کہ میں کیول سنگم کا چھور چھوا کر ناؤ کو واپس گھاٹ پر نہیں لگا دیتا بلکہ میں اس وقت تک ناؤ کو پانی میں تیراتا رہتا ہوں جب تک یاتری تیرنا چاہتے ہیں چاہے شام ہی کیوں نہ ہو جائے۔ چلیے اس طرف ہے میری ناؤ''۔ اس نے ناؤ کی طرف اشارہ کیا۔

اے۔ جے۔ آر اس کے پیچھے پیچھے کشتی تک پہنچ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی کشتی کی رسّی کھل گئی۔ ملاّح نے اپنا پتوار سنبھار لیا۔

''صاحب! اس سمے ہم جمنا میں ہیں۔ اس پانی کو دھیان سے دیکھیے۔ اس کا رنگ ہرا ہے۔ یہ رنگ پہلے اور بھی زیادہ ہرا تھا۔ اتنا ہرا کہ دور دور تک ہریالی بچھا دیتا تھا۔ دھرتی تو دھرتی، آدمیوں کے تن من میں بھی سبزا اُگا دیتا تھا۔ چہرے پر شادابی اور آنکھوں

میں چمک بھر دیتا تھا۔ دھیرے دھیرے اس میں سیاہی گھلتی گئی اور اس کا ہرا پن ہلکا ہوتا گیا۔ اس کے ہرے پن کے بارے میں بہت سی کہانیاں کہی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جمنا جی کسی پہاڑ سے زمرّد کا پتھر بہا کر لاتی تھیں اور وہ زمرّد جمنا کے پانی کو ہرا بھرا رکھتا تھا۔ بعد میں زمرّد کا وہ پہاڑ کہیں غائب ہو گیا اور اس کے جو ٹکڑے جمنا جی کے گربھ میں پڑے تھے ان پر بھی گرد بیٹھ گئی۔ تھوڑے بہت ذرّے جو دھول اور گرد سے بچے رہ گئے ہیں، یہ ہرا پن انھیں کا اثر ہے۔ ہمارے تاؤ تو یہ کہتے ہیں کہ جس طرح یہ دھرتی گائے کے سینگ پر ٹکی ہے، اسی طرح جمنا جی بھی ایک بہت بڑے توتے کے پروں پر کھڑی ہیں۔ یہ اسی توتے کے ہرے پروں کا کمال تھا کہ جمنا جی کا پانی پہلے کافی ہرا دکھائی دیتا تھا اور اب جو ہرا پن کم ہوا ہے اس کا کارن یہ ہے کہ پانی میں کچھ راکشش گھس آئے ہیں اور انھوں نے اُس توتے کے پروں کو نوچنا شروع کر دیا ہے۔ پھر بھی جمنا جی کا پانی اتنا میلا نہیں ہوا ہے جتنا کہ آگے آنے والی ندی کا ہوا ہے۔''

''ایسا کیوں؟''

''اس لیے کہ جمنا میں آستھا کم ہے۔''

''مطلب؟''

''لوگ اس میں اسنان کم کرتے ہیں۔''

''گنگا ترا پانی امرت، گنگا کی سوگندھ، گنگا میّا تو ہے پیری چڑھیو، رام تری گنگا میلی ہو گئی، چھورا گنگا کنارے والا۔۔۔۔

یکا یک ہندی سنیما جگت سے جڑے کچھ نام اور بول اے۔ جے۔ آر کے کانوں میں گونج پڑے۔ ان کے ذہن میں ایک بھی ایسا نام نہیں ابھرا جس میں جمنا ہو۔ ملّاح کے جملے کا مفہوم ان کے سامنے کھلنا شروع ہو گیا۔

اچانک ان کے سروں پر پرندوں کا ایک غول منڈرانے لگا۔

''یہ اتنے سارے پرندے کہاں سے آ گئے؟'' اے۔ جے۔ آر نے ان پرندوں

پر اپنی نگاہیں جماتے ہوئے ملاح سے پوچھا،

''صاحب! یہ باہر سے آئے ہیں۔ ایسے ان کے سیکڑوں جھنڈ ہیں جو رات دن ندی کے اوپر منڈراتے رہتے ہیں۔ جیسے ہی انھیں کوئی نئی ناؤ پانی میں اترتی ہوئی دکھائی دیتی ہے یہ اُدھر جھپٹ پڑتے ہیں''۔

''یہ کتنے خوبصورت ہیں۔ ان کے کالے اور سفید پر کتنے آکرشک لگ رہے ہیں اور انکی یہ لمبی چوڑی گلابی چونچ، اس کا تو جواب ہی نہیں! واقعی بہت خوبصورت چونچ ہے ان کی''۔

''صاحب! ہیں تو یہ سچ مچ بہت پیارے، پر نتو بے چارے بہت بھوکے ہیں۔ ذرا سا دانہ ان کی اور پھینکیے تو ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہ لیجیے پیکٹ اور اس میں سے دانہ پھینک کر دیکھیے کہ کیسے جھپٹتے ہیں۔''

اے۔ جے۔ آر نے ملاح کے ہاتھ سے پیکٹ لیکر اس میں سے ایک مٹھی دانہ پانی میں دور تک بکھیر دیا۔

پرندوں کا غول بجلی کی سی سرعت کے ساتھ نیچے آکر ان دانوں پر ٹوٹ پڑا۔ کچھ پرندے تو پانی کے اندر سے بھی دانوں کو اپنی چونچ میں پکڑ لائے۔

''صاحب! اس بار دانوں کو ہوا میں اوُپر اچھالیے۔''

''ایسا کیوں؟''

''اچھالیے تو سہی۔''

''اچھا!'' اے۔ جے۔ آر نے اس بار دانے ہوا میں اچھال دیے۔

پرندوں نے ان دانوں کو ہوا میں ہی روک لیا۔ ایک دانے کو بھی نیچے نہیں گرنے دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ پرندے کسی ذوُیا سرکس سے آئے ہوں جہاں اس فن میں انھیں برسوں تربیت دی گئی ہو اور انھوں نے خوب ریاضت بھی کی ہو۔

''کیسا لگا صاحب؟''

''بہت اچھا!'' اے۔ جے۔ آر نے بڑے اسٹائل سے ایک مٹھی دانہ خلا میں پھر اچھال دیا۔

پرندوں کی قلابازیاں پھر شروع ہوگئیں۔ دانوں کو پکڑنے کی کوشش میں پرندوں کے جسم اوپر نیچے ہونے لگے۔ ان کے پھڑ پھڑاتے ہوئے پر ایک دوسرے کے پروں سے ٹکرانے لگے۔ کچھ ایک پر ٹوٹ کر پانی پر آ گرے۔ بعض پرندے پانی کے اندر پہنچے دانوں کو پکڑنے کے لیے پانی میں ڈبکیاں لگانے لگے۔ اس عمل میں ان کے پر بھیگ کر ان کی پرواز میں رکاوٹ ڈالنے لگے۔

خلا میں اچھلے اور پانی میں گرے دانوں کے ختم ہوتے ہی اے۔ جے۔ آر نے کچھ اور دانے اچھال دیے۔ قلابازیوں کا رکا ہوا سلسلہ پھر سے جاری ہو گیا۔

''دانوں پر جھپٹتے ہوئے انھیں دیکھ کر بڑا اطمینان ملتا ہے صاحب!''

''اطمینان کیوں؟'' اے۔ جے۔ آر نے ملاح کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا

''اس لیے کہ اس دھرتی پر کچھ ایسے بھی دیس ہیں جن کے بھوکے پرندے اپنا پیٹ بھرنے ہمارے یہاں آتے ہیں!'' لفظ ہمارے یہاں، کو ملاح نے قدرے زور دے کر ادا کیا۔

اے۔ جے۔ آر کا چہکتا ہوا چہرہ اچانک مرجھا گیا۔ پیکٹ میں دانوں کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ ٹھٹھک کر باہر آ گیا۔

سامنے سے دریا غائب ہوگیا۔ آنکھوں میں صحرا آ بسا۔ دور دور تک ریت بچھ گئی۔ ریت پر جگہ جگہ دانے بکھرنے لگے۔ دانوں کی طرف سانولی صورت اور سفید لباس والے کچھ لوگ دوڑنے لگے۔ گرم ریت انہیں جھلسانے لگی۔ لو کی لپٹیں انہیں اپنی لپیٹ میں لینے لگی۔ دانوں کو پانے کے لیے وہ ریگستانی ریت کی اذیت برداشت کرنے لگے۔ گرد بادی جھکڑ کھانے لگے۔ صحرائی تھپیڑوں کی مار جھیلنے لگے۔ 'الہندی' کا یک بیک یہ لفظ اے۔ جے۔ آر

کے کانوں میں گونج پڑا۔ صحرائی زمین کے دہانے سے تحقیری لب ولہجہ میں نکلے ہوئے اس لفظ کا جو معنی اے۔ جے۔ آر کے ذہن میں اُبھرا، اس نے ان کی آنکھوں میں ایک چوپایا اُبھار دیا۔ اُن کا چہرہ نفرت، غصہ اور بیچارگی کی ملی جلی کیفیت سے بھر گیا۔

آہستہ آہستہ صحرا کھسک گیا۔ اس کی جگہ برفیلی وادیاں آ گئیں۔ ان وادیوں میں بھی جگہ جگہ دانے بکھیر دیے گئے۔

یہاں بھی سانولی صورت اور سفید لباس والے کچھ لوگ دانوں پر جھپٹتے ہوئے نظر آنے لگے۔ بھوک مٹانے کے لیے یخ بستہ زمین پر دوڑنے اور پھسل پھسل کر گرنے لگے۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپی بندوقوں کی کچھ نالیں بھی دکھائی دینے لگیں جیسے دانوں پر جھپٹنے والے بھوکے پیاسے انسان نہیں بلکہ کوئی ضرر رساں اور خوفناک جانور ہوں۔ اے۔ جے۔ آر کو ایک واقعہ یاد آنے لگا:

ایک دن انھوں نے اپنے پڑوسی توقیر علی کو راستے میں روک کر پوچھا تھا،

توقیر علی! تم واپس کیوں آ گئے، تمھارے ابا بہت پریشان ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ اتنا سارا خرچ کر کے توقیر کو بھیجا تھا اور وہ کچھ مہینوں میں ہی واپس آ گیا۔ پوچھنے پر بتاتا ہے کہ اس کا جی نہیں لگا۔ بھلا اس لیے بھی کوئی نوکری چھوڑ کر واپس آتا ہے، وہ بھی ایسے حالات میں جب اپنی زمین تنگ ہو چکی ہو۔''

''بھائی صاحب! ابا کو یہ بات کس طرح سمجھاؤں کہ اپنی زمین تو بعض وجوہات کی بنا پر صرف تنگ ہوئی ہے، ہمیں اپنا دشمن تو نہیں سمجھتی اور ہر وقت بندوق لے کر ہمارے پیچھے تو نہیں پڑی رہتی، وہاں تو ہمیں دشمن سمجھا جاتا تھا اور سوتے، جاگتے، کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے، ہر وقت ہم پر نظر رکھی جاتی تھی۔ جیسے ہم قیدی ہوں۔ ابا کو اس بات کا یقین نہیں آتا۔ وہ تو سمجھتے ہیں کہ وہاں کام کرنے والے عیش کی زندگی گزارتے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ مجھے وہاں بھیجنے اور وہاں سے چلے آنے میں ابا کا بہت برا نقصان ہوا ہے اور یہ نقصان صرف پیسوں کا نہیں بلکہ ان کے خوابوں اور خیالوں کا بھی ہوا ہے مگر میں وہاں رکتا تو شاید ابا

کا اس سے کہیں زیادہ نقصان ہو جاتا اور وہ نقصان ایسا ہوتا جس کی تلافی کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں بھائی صاحب!

توقیر علی کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

''کہاں کھو گئے صاحب؟'' ملاح نے اے۔ جے۔ آر کو مخاطب کیا۔

''اے۔ جے۔ آر خاموش رہے۔

''صاحب! کیا بات ہے؟ آپ ایک دم سے خاموش کیوں ہو گئے؟''

''نہیں تو، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے'' اے۔ جے۔ آر نے خود کو چھپانے کی کوشش کی۔

''دانہ ختم ہو گیا ہو تو ایک پیکٹ اور دے دوں صاحب؟''

''نہیں، ابھی ہے۔''

''تو ہاتھ کیوں روک دیا۔ ڈالیے نا۔''

''من نہیں کر رہا ہے۔''

''صاحب! ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو۔'' اے۔ جے۔ آر کی آواز دھیمی ہو گئی۔''

''پرندوں کو دانہ ڈالتے سمے ان کا ہماری طرف آنا اور ان کا دانوں کی اور جھپٹنا آپ کو کیا اچھا نہیں لگا تھا؟ سچ بتایئے گا۔''

''اچھا لگا تھا۔''

''کیا آپ کے اندر یہ خواہش نہیں جاگی تھی کہ کچھ دیر تک اور دانہ ڈالا جائے اور اس منظر کا مزہ لیا جائے؟''

''ہاں، یہ خواہش بھی جاگی تھی اور اگر میرے سامنے کچھ اور منظر نہیں آ گئے ہوتے تو تم سے دوسرا پیکٹ بھی مانگتا اور شاید اسکے بعد تیسرا بھی۔''

''صاحب! دو تین نہیں، لوگ درجنوں پیکٹ ڈالتے ہیں اور جب تک ناؤ پر سوار رہتے ہیں، اُن کے ہاتھ نہیں رکتے۔ چلتے وقت لوگ تھیلا بھر بھر کر دانوں کا پیکٹ لاتے ہیں۔ ختم ہو جاتا ہے تو ملاّحوں سے خریدتے ہیں۔ ملاّح اس وقت ان سے دُگنا تگنا پیسہ وصول کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے بھی لالچ آتا ہے کہ میں بھی یاتریوں کے جوش کا فائدہ اٹھاؤں اور دانوں کے پیکٹ کا منہ مانگے دام وصول کروں پر نتو میری آتما گوارا نہیں کرتی۔ اس لیے واجبی منافع لیتا ہوں اور آپ سے تو پیسہ بھی نہیں مانگا۔ اور آپ نہیں دیں گے تو مجھے پچھتاوا بھی نہیں ہوگا۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ کسی سے پیسہ لینے کو جی نہیں کرتا اور آپ بھی ایسے ہی لوگوں میں سے مجھے ایک لگے۔''

''شکریہ۔'' اے۔ جے۔ آر کی نظریں ملاّح کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ ملاّح کے پسندیدہ لوگوں میں شامل تھے بلکہ اس لیے کہ ملاّح کے مٹ میلے اور وقت گزیدہ چہرے میں بھی انھیں ایسی چمک محسوس ہوئی جو رشیوں منیوں کے چہرے پر محسوس ہوتی ہے۔

''بہتے دریا میں تو سبھی ہاتھ دھوتے ہیں، پھر تم کیوں نہیں؟ اور یاتری دانوں کے زیادہ دام تو اپنی مرضی سے دیتے ہوں گے، ان کے ساتھ کوئی زور زبردستی تھوڑے کی جاتی ہوگی۔''

''زور زبردستی صرف وہی نہیں ہوتی جو اوپر دکھائی دیتی ہے، کچھ زور بھیتر بھیتر بھی چلتا ہے صاحب! اور مرضی سے کوئی کچھ بھی نہیں دینا چاہتا! اگر ہم اپنی ناؤ کا ریٹ نہ بتائیں اور یاتریوں سے کرایہ نہ مانگیں تو دھنا سے دھنا سیٹھ بھی چپ چاپ ناؤ سے اتر کر چل دے اور رہی بہتے دریا میں ہاتھ دھونے کی بات تو من نہیں کرتا صاحب!''

اے۔ جے۔ آر کی آنکھوں میں ملاّح کے چہرے کی چمک اور تاب دار ہوگئی۔

اے۔ جے۔ آر کو اس کی پیشانی پر چنتی چمک بھی محسوس ہونے لگی۔

اچانک اے۔ جے۔ آر کے کانوں میں کچھ ٹکرانے کی آواز سنائی پڑی اور ان کی گردن پیچھے کی طرف مڑ گئی۔

ایک اور کشتی تیرتی ہوئی ان کے پاس آ پہنچی تھی۔ اس کشتی سے چاروں طرف دانے پھینکے جا رہے تھے اور پرندوں کا ایک بڑا غول تیزی سے دانوں پر جھپٹ رہا تھا۔ یہ آوازانھیں میں سے کچھ پرندوں کے آپس میں ٹکرا جانے کی آواز تھی۔

''اس چھینا جھپٹی میں تو کچھ پرندے گھائل بھی ہو جاتے ہوں گے؟'' اے۔ جے۔ آر نے ملاح کو مخاطب کیا جس کی توجہ اسی کی طرح پرندوں کے ٹکرانے کی آواز کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔

''کیول گھائل ہی نہیں ہوتے صاحب! کچھ تو مر بھی جاتے ہیں۔ آئے دن ان کی لاشیں پانی پر تیرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ملاح کی نظریں اے۔ جے۔ آر کی جانب مرکوز ہو گئیں۔

اے۔ جے۔ آر کے چہرے پر اداسی کی ایک اور پرت چڑھ گئی۔

''صاحب! آپ اوروں کی طرح نہیں ہیں۔''

کیا مطلب؟''

''آپ شاید میری طرح ہیں۔ دوسروں سے بالکل الگ۔ ایک اور بات بولوں صاحب؟''

''بولو۔''

''یہ جو اتنے دانے لٹائے جاتے ہیں۔ یہ ان بھوکے پرندوں کی بھوک مٹانے یا دان پونیہ کی غرض سے نہیں لٹائے جاتے۔''

''تو پھر کس لیے لٹائے جاتے ہیں؟'' اے۔ جے۔ آر کا تجسس بڑھ گیا۔

''جو لوگ پرندوں کی اور دانہ اچھالتے ہیں ان میں سے زیادہ تر لوگوں کو تو یہ پتا

بھی نہیں ہوتا کہ یہ پرندے بھوکے ہیں اور دور دراز کے دیسوں اور اپنے اپنے گھونسلوں جن کو یہ تنکا تنکا جوڑ کر بناتے ہیں، سے نکل کر صرف یہاں بھوک مٹانے اور اپنی جان بچانے آتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کی نیت دان پونیہ کی بھی ہوتی ہو پر نتو زیادہ تر لوگ ان کی طرف دانہ اس لیے پھینکتے ہیں کہ انھیں ایسا کرنے میں مزا ملتا ہے۔ دراصل وہ اسے ایک کھیل سمجھتے ہیں اور اس کھیل میں انھیں خوب آنند آتا ہے۔ یہ دانہ پھینکنا ویسا ہی ہے جیسا کہ دریا میں شکاری کا جال پھینکنا۔ فرق اتنا ہے کہ شکاری مچھلیوں کو جال میں پھنسا کر ان سے پیسہ بناتے ہیں اور یہاں پیسہ نہیں بنایا جاتا۔ صاحب! پیسہ تو نہیں بنایا جاتا پر نتو پیسے سے زیادہ قیمتی تفریح کا سامان حاصل کیا جاتا ہے۔ اسی بہانے کچھ لوگوں کا کاروبار بھی چل رہا ہے۔"

"کاروبار! کیسا کاروبار؟"

"ان دانوں کی یہاں آس پاس میں کئی کئی فیکٹریاں لگ گئی ہیں صاحب!

"کیا؟"

"ہاں صاحب! اور اس کاروبار سے صرف کاروباریوں کو ہی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے بلکہ اس سے بچو لیے اور پرشاسن کے لوگ بھی خوب خوب لابھ اٹھا رہے ہیں۔"

اے۔ جے۔ آر کی نگاہیں اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبے دانوں کے پیکٹ پر مرکوز ہوگئیں جس میں اب بھی کچھ دانے بچے ہوئے تھے۔

یہ وہ دانے تھے جو سنگم پر آنے والے یاتریوں کی تفریح کے سامان فراہم کرنے کے لیے تیار کیے گئے تھے اور جنھیں بھوکے پرندوں کے آگے پھینک کر دریاؤں کے دامن میں ایسے منظر بنائے جاتے تھے جو اپنے اندر گنگا اسنان سے بھی زیادہ کشش رکھتے تھے اور بقول ملاح جن کی سنگم کے کنارے فیکٹریاں کھل گئی تھیں۔

دیکھتا شفاف پلاسٹک کا پیکٹ غبارے کی طرح پھول کر کافی بڑا ہوگیا اور اس میں ادھر اُدھر سے کچھ فیکٹریاں آکر کھڑی ہوگئیں مگر یہ فیکٹریاں وہ نہیں تھیں جن کے مالک منافع

خور تھے اور جن میں دور دیسوں سے آ کر سنگم کے دریاؤں پر منڈرانے والے پرندوں کے آگے پھینکے جانے والے دانے تیار کیے جا رہے تھے بلکہ یہ وہ فیکٹریاں تھیں جو مختلف اوقات اور مختلف صورتِ حال میں دیس کے لوگوں کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اشیائے خوردنی تیار کرنے کے لیے کھولی گئی تھیں اور جن کی دیکھ بھال منافع خور تاجر نہیں بلکہ ملک کی انتظامیہ کرتی تھی اور انتظامیہ اپنی اس کارگردگی کی خبر عوام تک پہنچانے اور اپنے کارنامے کو مشتہر کرنے کے لیے وقت وقت پر اخباروں کے پورے پورے صفحے پر اشتہار بھی چھپواتی تھی۔

''صاحب! اس کاروبار کے لیے پنچھی دان کے نام پر لوگوں کو سرکار کی اور سے سستے داموں زمینیں بھی الاٹ کی گئی ہیں۔''

''اچھا!''

آنکھوں کے سامنے پھیلے ہوئے اس پیکٹ میں کچھ اور فیکٹریاں بھی آ کر کھڑی ہو گئیں۔ یہ پہلے سے موجود فیکٹریوں کے مقابلے میں بڑی اور اونچی تھیں۔ ان کی دیواروں کے رنگ و روغن کافی روشن تھے اور ان کی بناوٹ بھی مختلف تھی۔ البتہ دونوں کی زمین ایک تھی، لگتا تھا یہ عالیشان فیکٹریاں بھی انھیں فیکٹریوں کی زمین کے کچھ حصّوں پر کھڑی کی گئی تھیں جو پہلے سے موجود تھیں۔

صاحب! ایک طرف ان پرندوں کو یہاں دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ دنیا میں ہم سے بھی گئے گزرے دیس موجود ہیں اور دوسری اور ان کی حالت پر دکھ ہوتا ہے کہ یہ بے چارے تو مصیبت کے مارے یہاں آئے ہیں اور ہم ان کی مجبوری کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ انھیں اپنی تفریح کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ ان سے ہوا میں قلابازیاں کھلوا رہے ہیں۔ پانی میں ڈبکیاں لگوا رہے ہیں۔

پیکٹ کے منظروں سے ہٹ کر اے۔ جے۔ آر کی توجہ ملاح کے بیان کی جانب مرکوز ہو گئی تھی۔ ملاح کا بیان اے۔ جے۔ آر کے کانوں میں داخل ہو کر ان کی آنکھوں میں ایک منظر ابھار رہا تھا۔ ایسا منظر جس میں پانی اپنی بھیانک صورت دکھا رہا تھا۔ سیلاب کا

دیو ہیکل دھرتی پر تانڈو کر رہا تھا۔ بستیاں زیروزبر ہو رہی تھیں۔ چاروں طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ اس دل سوز صورتِ حال میں بھی تجارت کا بازار گرم تھا۔ روٹی کے بدلے ماؤں کی آنکھوں کے تارے اور باپوں کے جگر کے ٹکڑے بیچے اور خریدے جا رہے تھے۔ پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے بہو بیٹیوں کے تن کا سودا کیا جا رہا تھا۔

ایک گھر میں ایک ماں اپنے لاڈلے کو بھوک کی شدّت کے باوجود خود سے الگ نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ کسی طرح بھی بچّے کو بیچنے کے لیے راضی نہیں ہو رہی تھی۔ میاں بیوی کے درمیان کشمکش جاری تھی کہ مرد کو ایک قصّہ یاد آ گیا۔ اس نے بیوی کو سنانا شروع کیا:

ایک دن ایک درویش سے کسی مرید نے پوچھا،

حضرت! دین کے کتنے فرائض ہیں؟''

درویش نے جواب دیا، چھ''

چھٹا کون؟'' مرید نے دوبارہ سوال کیا۔

''کھانا'' درویش نے جواب دیا۔

اس محفل میں ایک عالم دین بھی موجود تھے۔ انھوں نے چھٹے فرض کو ماننے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ شریعت کی رو سے کل پانچ فرائض ہیں اور ان میں کھانا نہیں ہے۔ درویش نے بحث نہیں کی صرف اتنا کہا کہ آپ مانیں یا نہ مانیں۔ مگر ایک فرض کھانا بھی ہے۔ عالمِ دین اس محفل سے اٹھ کر چلے گئے۔

ایک دن اس عالمِ دین کا ایک سمندری سفر ہوا۔ اس سفر میں ان کی کشتی طوفان میں پھنس گئی۔ کسی طرح ان کی جان بچ گئی۔ گرتے پڑتے وہ سمندر کے کنارے پہنچے۔ انھیں بھوک محسوس ہوئی مگر دور دور تک کھانے پینے کا کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ بھوک بڑھتی جا رہی تھی اور بھوک کی وجہ سے ان کی حالت بھی

خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اتنے میں ایک آواز سنائی پڑی۔

''روٹی لے لو روٹی!''

عالم دین اس آدمی کی طرف لپکے جو آوازیں لگا رہا تھا۔ پاس پہنچ کر وہ بولے،

''مجھے دو۔ میں بہت بھوکا ہوں۔''

''ایک روٹی کی قیمت ایک نیکی ہے۔''

یہ سن کر عالم دین بولے،

''نہیں، نہیں، میں نیکی سے روٹی نہیں خریدوں گا۔ بڑی محنت اور ریاضت سے میں نے یہ نیکیاں کمائی ہیں''

ان کا جواب سن کر روٹی والا چلا گیا۔ عالم دین کی بھوک بڑھتی گئی۔ شام کو پھر وہ آواز سنائی پڑی۔

''روٹی لے لو، روٹی!''

عالم دین نے آواز لگانے والے کو بلایا اور کہا ''ٹھیک ہے نیکی کے بدلے ہی سہی روٹی دے دو''۔

بیچنے والا بولا، ''اب روٹی کی قیمت وہ نہیں، جو پہلے تھی۔ اب ایک روٹی تمام نیکیوں کے بدلے میں ملے گی۔''

''نہیں نہیں، اپنی تمام نیکیوں سے میں روٹی نہیں خرید سکتا، تم جاؤ''

انھوں نے روٹی خریدنے سے منع کر دیا، روٹی بیچنے والا چلا گیا۔

کسی طرح رات گزری۔ صبح آتے آتے بھوک ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ وہی آواز پھر سنائی پڑی، ''روٹی لے لو روٹی!''

عالم دین نے روٹی بیچنے والے کو پکارا۔ روٹی بیچنے والے نے عالم دین کی بے تابی دیکھ کر لاپرواہی سے بولا،

''آج قیمت اور بڑھ گئی ہے۔ اب ایک روٹی کے بدلے موجودہ نیکیوں کے علاوہ آئندہ کمانے والی نیکیاں بھی دینی پڑیں گی''۔

عالم دین بھوک کی شدت سے اس حد تک مجبور ہو گئے تھے کہ وہ بغیر کچھ سوچے

اور بنا دیر کیے بول پڑے!

''ٹھیک ہے آنے والی نیکیاں بھی لے لو مگر روٹی فوراً دے دو۔''

کہانی کی منطق اور بھوک کی شدّت نے ماں کی باہوں کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ بچہّ ماں کی آغوش سے نکل کر تاجر کی مال گاڑی میں پہنچ گیا۔

''صاحب! اب ہم گنگا میں آ گئے ہیں۔''

''کیا؟'' اے۔ جے۔ آر کی آنکھیں سیلاب کے منظر سے نکل کر گنگا کے پانی کی طرف مبذول ہو گئیں۔

''ہاں صاحب! ہماری ناؤ اس وقت گنگا میں تیر رہی ہے۔''

''یہ گنگا ہے!'' پانی کو دیکھتے ہی اے۔ جے۔ آر چونک پڑے۔۔۔۔

''جی ہاں، یہی گنگا ہے۔''

''یہ وہی گنگا ہے جو سب کی ماں کہلاتی ہے۔ جو اپنے دامن میں سب کے دکھوں کو بھر لیتی ہے۔ اپنی سفیدی سے سیاہیوں کو دھو ڈالتی ہے۔ جس کے جل سے آتما تک کی شدھی ہو جاتی''

''ہاں صاحب! یہ وہی گنگا ہے۔''

''مگر اس کا جل تو_____

''صاحب! جب سارا سنسار اپنے من اور تن کے ساتھ ساتھ اپنے گھر آنگن اور کل کارخانوں کا میل بھی اس میں ڈالے گا تو کیا ہوگا؟ ذرا ادھر تو دیکھیے صاحب!'' ایک ناؤ کی طرف ملاح نے اشارہ کیا۔۔۔

اشارے کی طرف اے۔ جے۔ آر کی نظریں اٹھیں تو ایک ننگ دھڑنگ جسم سے گنگا میں گرنے والے رقیق مادہ کو دیکھ کر شرم سے پلکیں جھک گئیں۔

''یہ تو نمبر ایک کا نظارہ ہے صاحب! ہماری آنکھیں تو اکثر نمبر دو کا نظارہ بھی کرتی ہیں۔ آئے دن گلی سڑی لاشیں بھی دکھائی دیتی رہتی ہیں۔ کل کارخانوں کا جو گندا پانی آتا

ہے سوالگ۔اب آپ ہی بتایئے ،ایسے میں بھلا پانی کیسے صاف رہ سکتا ہے''؟

راگھورائے سنگھ کے کہنے پر اے۔جے۔آر نے نہانے کے کپڑوں کا ایک جوڑا اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا تھا یہ سوچ کر کہ جب سنگم پر جا رہے ہیں تو گنگا میں ایک ڈبکی بھی لگا لیں گے مگر سامنے کے منظر اور پانی کے رنگت کو دیکھ کر ڈبکی لگانے کا ان کا ارادہ سرد پڑ گیا۔

''صاحب!اب ہم اس استھان پر پہنچ گئے ہیں جسے دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے ہزاروں روپے خرچ کر کے آتے ہیں اور جس کا درشن کر کے مرنے کے بعد کی چنتاؤں سے مکت ہو جاتے ہیں اور بہت سے لوگ تو اس کے درشن کے پہنے کو سا کار کیے بنا ہی اس دنیا سے سدھار جاتے ہیں۔یہ دیکھیے دو ندیوں کا ملن۔ایک طرف سے گنگا جی آ رہی ہیں اور دوسری اور سے جمنا جی۔دونوں کا رنگ الگ الگ دکھائی دے رہا ہے۔دونوں ایک دوسرے سے مل بھی رہی ہیں اور مل کر آپس میں ملنے کے بجائے ایک دوسرے سے الگ بھی رہ رہی ہیں۔اسی ادبھوت ملن کو سنگم کہتے ہیں۔''

اے۔جے۔آر کی آنکھیں اس ملن کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں،واقعی کمال کا ملن تھا۔دونوں ندیاں ایک دوسرے میں پیوست تھیں مگر دونوں صاف صاف ایک دوسرے سے الگ دکھائی دے رہی تھیں۔کوئی کسی کے دائرے میں گھسنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔

اس منظر نے اے۔جے۔آر کے کانوں میں دفعتاً دو لفظوں کا ایک مرکب ٹپکا دیا۔ ساعت میں اس مرکب کے داخل ہوتے ہوئے ان کی آنکھوں کے سامنے ایک دوسرا منظر ابھر آیا: توقیر علی کے والد تنویر علی عید کی نماز پڑھ کر عید گاہ سے گھر لوٹے ہیں۔ان سے ملنے اے۔جے۔آر کے پتاوجے جسونت رائے سنگھ ان کے گھر پہنچے ہیں۔تنویر علی سفید کرتا اور چارخانے کی لنگی پہنے ہوئے ہیں۔ان کے سر پر سفید ٹوپی ہے اور وجے جسونت رائے دھوتی کرتے میں ملبوس ہیں۔ان کا سر خالی ہے۔دونوں ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں۔ اس طرح کہ دونوں کی باہیں ایک دوسرے کو آغوش میں بھر لیتی ہیں۔دونوں کی چھاتی ایک دوسرے سے مل جاتی ہے۔دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو جاتے ہیں کہ دونوں

کے درمیان ہوا کا گزر بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔

ایسا ہی ایک منظر اور ابھر آیا۔ اس میں بھی دونوں پڑوسی اسی طرح گلے مل رہے ہیں۔ دونوں اپنے اپنے مخصوص لباس میں ملبوس ہیں۔ فرق بس اتنا ہے کہ اس منظر میں تنویر علی کی پیشانی پر جہاں سیاہ گھٹا پڑا ہوا ہے، اس کے پاس گلال بھی چمک رہا ہے۔ اور سیاہ گھٹے والی پیشانی پر چمکنے والے گلال سے وجے جسونت رائے کی آنکھیں گلنار ہو گئی ہیں اور ان کے چہرے سے سرخ شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔۔۔۔۔۔

''صاحب! ہے نا یہ ادبھوت ملن!''

''ہاں، ہے۔ کاش! یہ ملن۔۔۔۔''

جملے کا دوسرا حصہ اے۔ جے۔ آر نے بہت ہی دھیمی آواز میں ادا کیا اور جملے کو ادھورا چھوڑ دیا۔

''آپ نے کچھ کہا صاحب؟'' ملاح نے پوری بات سننی چاہی مگر اے۔ جے۔ آر نے ''نہیں تو'' کہہ کر ٹال دیا۔ اور دوسری بات شروع کر دی۔

''اس کو ترویٰنی بھی تو کہا جاتا ہے''؟

''جی صاحب، اسے ترویٰنی بھی کہتے ہیں، ترویٰنی ارتھات تین ندیوں: گنگا، جمنا اور سرسوتی کا سنگم۔ پر نتو سرسوتی جی لپت ہیں''۔

''سرسوتی جی واستو میں ہیں بھی یا ان کا وجود محض ایک متھ' مطلب کہانی بھر ہے؟''

ہیں صاحب! ہیں! سرسوتی جی ہیں! وہ دکھائی بھی دیتی ہیں پر نتو کسی کسی کو، سبھی کو نہیں۔''

''تمھیں دکھائی دیتی ہیں؟''

ہاں صاحب! مجھے دکھائی دیتی ہیں۔''

''کمال ہے!'' اے۔ جے۔ آر کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں صاحب! مجھے سرسوتی جی دکھائی دیتی ہیں۔''

''کدھر دکھائی دیتی ہیں؟''

''یہیں پر صاحب! ان دونوں کے سنگم کے نیچے''

کتنا نیچے؟''

''بہت نیچے۔''

''پانی کے اندر تمھاری نظریں ان تک پہنچ جاتی ہیں؟''

''ہاں صاحب! پہنچ جاتی ہیں۔''

''اچھا!''

''آپ کو اچنبھا ہو رہا ہے صاحب! پر نتو یہ سچ ہے کہ کچھ نظریں پانی کے اندر تک پہنچ جاتی ہیں۔''

''ان میں سے ایک تمھاری بھی ہیں؟''

آپ کو میری 'ہاں' چھوٹا منہ اور بڑی بات لگے گی مگر سچ یہی ہے صاحب!

''میری حیرانی اس لیے نہیں ہے کہ یہ بات کسی مہا پنڈت یا مہا پُرش کے بجائے کوئی ملاح کہہ رہا ہے بلکہ اس لیے ہے کہ یہ انوکھی بات ہے۔ حیران کر دینے والا سچ ہے اور جس طرح کے تم آدمی ہو اور اب تک جتنا میں نے تم کو جانا ہے، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم جھوٹ نہیں بول سکتے۔''

''صاحب! جب مجھ پر آپ کو اتنا یقین ہے تو اس انوکھی بات پر بھی یقین کر لیجیے کہ آپ کے اس سیوک نے سرسوتی جی کو دیکھا ہے۔''

''کرنا ہی پڑے گا۔''

''دھنیہ باد۔'' ''بہت بہت دھنیہ باد صاحب!''

''جب تم نے سرسوتی جی کو دیکھا ہے تو ان کے بارے میں مجھے اور بھی کچھ بتاؤ۔''

''بولیے کیا جاننا چاہتے ہیں؟''

''سب سے پہلے تو یہی کہ ان کا پانی کیسا ہے؟''

''بہت صاف! بالکل آئینے کے موافق۔ ایک دم اجول!''

''ان کا رنگ ان میں سے کس کی طرح ہے؟ گنگا جی کی طرح یا جمنا جی کی طرح؟

''ان دونوں سے الگ ہے صاحب!

''کوئی روپ تو ہوگا اس کا۔ مرا مطلب ہے جس طرح جمنا جی کا ہلکا ہرا اور گنگا جی کا مٹ میلا دکھائی دے رہا ہے اسی طرح سرسوتی جی کا بھی تو کوئی اپنا رنگ ہوگا۔''

''ہاں ہے، مگر وہ ہرا، اجلا، نیلا پیلا جیسا رنگ نہیں ہے۔''

''تو پھر کیسا ہے؟''

''وہ وی چتر رنگ ہے، اس میں جمنا جی کا رنگ بھی شامل ہے اور گنگا جی کا رنگ بھی۔ مگر گنگا جی کا یہ رنگ نہیں، ان کا پہلے والا رنگ۔ اس میں چاند، سورج اور ستاروں کا رنگ بھی گھلا ہوا ہے اور آسمان کا رنگ بھی۔ شاید زمین کا رنگ بھی اس میں موجود ہے۔ صاحب! میں بتا نہیں سکتا کہ واستو میں اس کا رنگ کیسا ہے؟ پر نتو ہے وہ بہت ہی اچھا رنگ۔ بہت ہی آکرشک! بہت ہی پیارا!''

اے۔ جے۔ آر کی نگاہیں ملاح کے چہرے میں کھوتی جا رہی تھیں۔

''وہ کدھر سے آتی ہیں اور کدھر جاتی ہیں؟''

''صاحب، اس کا پتا تو نہیں چل پاتا۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ کافی پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے دھارے چاروں اور بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔''

''بہاؤ کیسا ہے؟''

''نہ زیادہ، نہ کم، بہت ہی سنتولت گتی ہے ان کی۔''

''موجیں اٹھتی ہیں؟''

''خوب! پرنتو بپھری ہوئی نہیں، اپنی سیما میں رہ کر چلنے والی۔ انھیں دیکھ کر رگوں میں ترنگیں دوڑ جاتی ہیں۔''

''سرسوتی جی کو دیکھ کر کیسا محسوس ہوتا ہے؟''

''ایسا لگتا ہے جیسے پگھلی ہوئی چاندی میں گھلے ہوئے ہیرے موتی دیکھ رہے ہوں۔ دیکھنے سے آنکھوں میں روشنی سی بھر جاتی ہے۔ کانوں میں جل ترنگ بج اٹھتا ہے۔ من دھل جاتا ہے۔ دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے ان میں کود جاؤں۔ ان کی گود میں پڑا رہوں۔ کبھی باہر نہ نکلوں۔''

ملاح کی باتیں سنتے وقت اے۔ جے۔ آر کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی دیوی کا ذکر کر رہا ہو۔ ایسی دیوی کا ذکر جس کے ماتھے پر ایسا تیج ہو کہ جسے دیکھ کر کھملایا ہوا چہرہ بھی کھل جائے۔ جس کی آنکھوں میں ایسی جوت ہو کہ جس سے اندھیرے بھی روشن ہو اٹھیں۔ ویرانے بھی جگمگا جائیں۔ جس کے چہرے پر ایسا سکون ہو جو وچلت من کو بھی شانت کر دے۔ جس کی آواز میں ایسا سر ہو کہ جس کے کان میں پڑتے ہی دل و دماغ میں علم و آگہی کے خزانوں کے در کھل جائیں۔ جسم و جان میں مٹھاس گھل جائے۔ رگ و پے میں کیف و سرور بھر جائے۔ ''صاحب! سرسوتی جی بھلے ہی لوگوں کو دکھائی نہیں دیتیں پرنتو وہ اپنا کام اندر ہی اندر کرتی رہتی ہیں۔

اپنا رنگ چڑھاتی رہتی ہیں۔ اپنا اثر دکھاتی رہتی ہیں۔ یہ انھیں کی کرپا ہے کہ یاتریوں کو پانے کے لیے میں اتاؤلا نہیں رہتا اور بنا مول تول کیے مجھے آپ جیسے یاتری مل جاتے ہیں اور جب نہیں ملتے تب بھی مجھے بے چینی نہیں ہوتی۔ یہ انھیں کی کرپا ہے صاحب! کہ ان بھوکے پرندوں کو دیکھ کر اس بھیڑ میں کچھ آنکھیں نم بھی ہو جاتی ہیں۔ یہ انھیں کی مہیما ہے کہ آج بھی کہیں کہیں پر ہریالی اور کسی کسی دل مین صفائی باقی ہے۔

اے۔ جے۔ آر کے ذہن میں ایک منظر اُبھر آیا: ایک مشتعل مجمع ایک معصوم بچے کو اپنے نرغے میں لے رکھا ہے۔ ترشول کی نوکیں بچے کی چھاتی کی اور بڑھ رہی ہیں۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ بیچارہ تو معصوم ہے اس کا کیا دوش ہے؟ اسے چھوڑ دو۔

''ایک آدمی بھیڑ سے نکل کر بچے کے پاس آ جاتا ہے۔

''نہیں، ہم اپنے شترو کی سنتان کو نہیں چھوڑیں گے۔ یہ انہیں کی سنتان ہے جنھوں نے ہمارے لوگوں کے گلے سے اوم اُتار کر اس کی جگہ کراس ڈال دیا ہے''

''مانا کہ اس کے قوم کے لوگ لالچ دے کر ہمارے لوگوں کا دھرم پریورتن کر رہے ہیں پر تو اس بالک کا اس سے کیا لینا دینا۔ یہ بیچارہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ کون ہے؟ اس کے دھرم کا نشان اوم ہے یا کراس۔ اسے چھوڑ دو، اسے مارنے سے کچھ نہیں ملے گا۔''

''نہیں ہم نہیں چھوڑیں گے۔ آگے چل کر یہی ہمارے دھرم کو بھرشٹ کرے گا۔ آپ ہٹ جایئے۔ ہمیں اپنا کام کرنے دیجیے۔''

''نہیں میرے ہوتے ہوئے آپ اسے نہیں مار سکتے۔'' وہ آدمی بچے کے آگے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''ہٹ جایئے نہیں تو۔۔۔۔۔

''نہیں، میں اپنے جیتے جی یہ ادھرم نہیں ہونے دونگا۔''

''ہٹ جایئے ورنہ۔۔۔۔

''نہیں میں نہیں ہٹوں گا۔''

''تو ٹھیک ہے مریے۔'' ترشول کی نوکیں اس آدمی کے سینے میں پیوست ہو جاتی ہیں مگر وہ بچے کو مرنے سے بچا لیتا ہے۔

''میں تو بھگوان سے یہی پراتھنا کرتا ہوں صاحب کہ سرسوتی جی کبھی اوپر نہ آئیں اور لوگوں کو دکھائی نہ دیں۔''

''کیوں؟ ایسی پراتھنا کیوں کرتے ہو؟''

''ڈرتا ہوں صاحب؟''

''کیوں ڈرتے ہو؟''

''کہیں ان کا بھی _____'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ان کا بھی کیا؟'' اے۔ جے۔ آر نے پورا جملہ سننا چاہا۔

''کیا یہ بات آپ کو بھی بتانی پڑے گی صاحب؟'' جواب دے کر ملاح اے۔ جے۔ آر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

اے۔ جے۔ آر خاموش رہے۔ نہ جواب دیا اور نہ ہی کوئی اور سوال کیا۔ بس جلدی سے اپنا ہینڈ بیگ کھول لیا۔

بیگ سے نہانے کا کپڑا ہاتھ میں لے لیا۔ ان کی نگاہیں اس کپڑے پر مرکوز ہو گئیں۔

''آپ، اسنان کرنا چاہتے ہیں تو چلیے میں ناؤ کو سنگم سے سٹا کر لگا دیتا ہوں؟''

''نہیں، اسکی ضرورت نہیں ہے۔''

''تو کیا یہیں نہائیں گے؟

''نہیں،''

''تو پھر؟''

''میں اسنان کر چکا؟''

''کب؟ کہاں؟'' ملاح ان کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

''سرسوتی جی میں۔''

''سرسوتی جی میں! وہاں آپ کب پہنچے؟''

''جب تم ان کا بکھان کر رہے تھے۔''

''تو آپ کو بھی وہ دکھ گئیں؟''

''ہاں، سرسوتی جی مجھے بھی دکھائی دے گئیں'' اے۔ جے۔ آر نے اپنی نگاہیں ملاح کے چہرے سے سرکا کر اس کی آنکھوں تک پہنچا دیں۔

''صاحب! میں سوچتا تھا کہ سرسوتی جی ضرور آپ کو بھی دکھائی دیں گی۔ اور من ہی من میں میں نے آپ کے لیے پرا تھنا بھی کی تھی۔ انھوں نے میری سن لی، جے ہو

سرسوتی میّا!''

اس نے پتوار کو پانی میں اس انداز سے گھمایا کہ پانی پر ناؤ ناچ گئی۔

''اب واپس چلیں'' اے۔جے۔آر نے ہینڈ بیگ بند کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا''

''چلیے''

ناؤ سنگم سے پلٹ کر گھاٹ کی طرف جانے لگی۔

پرندوں کا ایک غول پھر سے ان کے سروں پر منڈرانے لگا۔

''دانوں کا پیکٹ دوں صاحب؟ ملاّح نے اے۔جے۔آر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، ابھی کچھ دانے بچے ہیں۔'' اور ناؤ سے پیکٹ اٹھا کر بچے ہوئے دانوں کو گنگا میں الٹ دیا۔

پرندوں کی طرف دانہ ڈالنے کا انداز اس بار وہ نہیں تھا جو جمنا میں اترتے وقت دکھائی دیا تھا۔

اُتّم چندوالیہ

سوٹ اور ٹائی میں ملبوس گندمی رنگ کے ایک صاحب اکثر ہمارے دفتر کے کیمپس میں دکھائی دیتے۔ خاموشی سے داخل ہوتے اور ادھر اُدھر دیکھے بغیر سیدھے پروفیسر جمال کے کمرے کی طرف بڑھ جاتے۔

حسبِ معمول ایک دن وہ کیمپس میں داخل ہوئے۔ خاموشی سے جمال صاحب کے روم کی جانب بڑھے مگر جلدی ہی واپس آ کر کیمپس کے لان میں بے چین سے ٹہلنے لگے۔ کچھ دیر تک وہ لان کا چکّر کاٹتے رہے پھر جھجکتے جھجکتے میرے کمرے کی طرف بڑھ آئے۔ ''کیا میں حاضر ہوسکتا ہوں'' دروازے کے پاس پہنچ کر نہایت ادب کے ساتھ بڑے ہی شائستہ لہجے میں مجھ سے انہوں نے اجازت طلب کی۔

''جی، ضرور، تشریف لائیے'' میں نے انہیں اندر بلالیا۔ وہ میرے کمرے میں داخل ہوگئے مگر کھڑے رہے

''تشریف رکھیے'' میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا

''شکریہ'' وہ سامنے والی کرسی پر محتاط انداز میں بیٹھ گئے۔

''جی فرمائیے۔'' حسبِ عادت ہر آنے والے کی طرح ان سے بھی میں نے ان کی منشا معلوم کی۔

''جمال صاحب آج نہیں آئے ہیں کیا؟ انہوں نے کچھ پریشان کن لہجے میں

سوال کیا

''نہیں۔وہ لمبی چھٹی پر باہر گئے ہوئے ہیں۔''

''لمبی چھٹی!'' حیرتی لہجے میں وہ یہ فقرہ دہرا کر خاموش ہو گئے جیسے میرے جواب نے ان پر فالج گرا دیا ہو۔ ان کے چہرے پر اداسی آمیز مایوسی چھا گئی۔

''کیا بات ہے! کوئی ضروری کام تھا کیا؟'' میں نے ان کی پریشانی کا اندازہ لگاتے ہوئے سوال کیا۔

''جی'' انہوں نے بہت ہی آہستہ سے جواب دیا

''آپ میسج دے دیجیے، میں ان تک پہنچا دوں گا

''میسج سے کام نہیں چلے گا سر۔''

''ایسا کیا کام ہے کہ آپ اس قدر پریشان ہو گئے؟''

''بات دراصل یہ ہے سر کہ میں اردو سے ایم۔اے کر رہا ہوں۔ تیاری کے سلسلے میں جمال صاحب سے رہنمائی حاصل کرنے یہاں آتا ہوں۔ امتحان قریب ہے اور رہنمائی کرنے والا دور۔ اس بات نے مجھے بوکھلا دیا ہے''

''بس یہی بات ہے۔''

''جی، مگر یہ بات بس یہی بات تک محدود نہیں ہے، میرے لیے تو یہ بے چین کر دینے والی بات ہے۔''

''گھبرائیے نہیں، پروفیسر جمال جب تک نہیں آتے ہیں آپ کا یہ کام میں کر دیا کروں گا۔''

''آپ!''

کیوں؛ میں نہیں کر سکتا! میں بھی اردو کا لیکچر ہوں صاحب!

''یہ بات نہیں ہے سر۔

''تو پھر یہ حیرانی کیوں؟''

بات دراصل یہ ہے سر کہ مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے کہ آپ میری مدد فرمائیں گے۔

''کیوں''_____؟

''کیوں کہ اس کام کے لیے آپ نے اتنی آسانی سے حامی جو بھر دی۔'' کوئی حلیہ حجت، نہ کوئی شرط، نہ ہی کسی قسم کا کوئی مطالبہ اور نہیں کوئی۔۔۔۔۔

''دیکھیے، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو علم بانٹنے میں آنا کانی کرتے ہیں یا اس کے لیے کسی قسم کا سودا کرتے ہیں۔ بتایئے آج آپ کیا پڑھنا چاہتے ہیں؟۔۔۔''

''سر آج میں میرؔ کو سمجھنا چاہتا ہوں، ان کی امتیازی خصوصیات جاننا چاہتا ہوں''

''بہتر'' میں نے مزید کسی گفتگو کے میر کی شاعری کی امتیازی خصوصیات پر بولنا شروع کر دیا۔

''سر'' میں نوٹ کرتا جاؤں۔''

''ضرور، جو پوائنٹس آپ کو اہم لگیں انہیں نوٹ کر لیجیے'' میں نے اپنی گفتگو کی رفتار دھیمی کر دی۔

''۔۔۔۔۔میرؔ کی ایک اور اہم خصوصیت 'دردمندی' ہے۔ ان کی 'دردمندی' کئی صورتوں میں ضاہر ہوتی ہے ایک صورت یہ ہے۔

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا

تو ہم سایہ کاہے کو سوتا رہے گا

میرؔ اپنے درد سے پریشان ہیں۔ ان کا درد انہیں بُری طرح رلا رہا ہے مگر انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ ان کا اس طرح رونا دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے۔ میر کا یہ شعر۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو

ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

بھی ان کی دردمندی کی ایک صورت کا غماز ہے۔ میرؔ کا یہ وصف میر کو امتیازی

شان عطا کرتا ہے۔۔۔۔۔

''امید ہے میرؔ کی شاعری کی کچھ بنیادی باتیں واضح ہوگئی ہوں گی۔'' تقریباً پینتس چالیس منٹ کے بعد میں نے میر تقی میرؔ کا سلسلہ ختم کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی، بالکل، ایک ایک بات واضح ہوگئی۔ ایک ایک نکتہ ذہن نشیں ہوگیا۔ جناب کا اس مہربانی کے لیے بے حد شکریہ۔''

''اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک استاد ہونے کے ناطے میرا یہ فرض ہے کہ کسی علمی معاملے میں میں کسی کے کام آؤں۔''

''یہ تو آپ کا بڑپن ہے صاحب آپ کا یہ خیال جان کر میرے دل میں آپ کی قدر اور بڑھ گئی۔

''شکریہ۔ کچھ اور پڑھنا ہے یا آج کے لیے اتنا کافی ہے؟''

''اتنا کافی ہے سر!___ سر آپ سے ایک گزارش تھی۔''

''فرمایئے۔''

''آپ برا نہ مانیں تو عرض کروں؟''

''بتایئے کیا بات ہے؟''

''سر یہ کچھ پھل ہیں میرے باغ کے انہیں جمال صاحب کے لیے لایا تھا مگر ان پراب آپ کا۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ انہیں قبول کر لیتے تو مجھے خوشی ہوتی۔

''دیکھیے، میں پڑھائی لکھائی کے سلسلے میں کسی سے کچھ نہیں لیتا اس لیے میں انہیں نہیں رکھ پاؤں گا''

''سر یہ کسی قسم کا کوئی Return نہیں ہے۔ اسے لانے میں صرف میری شردھا اور میرا خلوص شامل ہے۔ مجھے یقین تھا کہ آپ میرے خلوص کو ٹھکرائیں گے نہیں اسی لیے میں ہمت بھی کر سکا۔ ایک بار پھر آپ سے التجا ہے کہ میرے اس خلوص___''

''ٹھیک ہے رکھ دیجیے مگر آئندہ خیال رکھیے گا کہ مجھے یہ سب پسند نہیں''

''جی بہتر، سر میں دوبارہ کب آجاؤں؟''

''جب چاہیں۔''

''آپ کو کوزحمت تو ہوگی____

''مجھے کوئی زحمت نہیں ہوگی۔آپ اس کام کے لیے میرے پاس بلا جھجک آسکتے ہیں''

''شکریہ۔ویسے کون سا وقت مناسب رہے گا؟''

''شام سے تھوڑا پہلے، یہی چار اور پانچ کے بیچ''

''جی، بہتر، سر اب میں چلوں؟''

اجازت لے کر وہ چلے گئے۔جاتے وقت ان کا چہرہ ان کیفیات سے آزاد تھا جو آتے وقت وہ اپنے ساتھ لائے تھے اور جن میں یہ سن کر اور بھی شدت پیدا ہوگئی تھی کہ پرنسپل صاحب لمبی چھٹی پر باہر گئے ہوئے ہیں۔

تین چار روز بعد وہ دوبارہ تشریف لائے رسمی گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ ان کا نام اتم چند والیہ ہے۔وہ گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر ہیں اور اپنے شوق یا کسی ضرورت کی خاطر اس عمر میں ایم۔اے۔کر رہے ہیں۔انہوں نے اپنا موضوع بتایا اور میں شروع ہوگیا۔ موضوع کے ایک ایک پہلو کی جب وضاحت ہوگئی اور ان کے ایک ایک سوال کا جواب انہیں مل گیا تو بولے ''سر آپ بڑی اچھی طرح سمجھاتے ہیں۔موضوع کا ایک ایک پہلو آئینے کی طرح صاف ہوجاتا ہے۔پوری طرح تسلی ہوجاتی ہے۔آپ کے سمجھانے کا انداز بھی بہت پیارا ہے اور آپ کے علم کا کیا کہنا وہ تو دریا ہے دریا، شروع ہوتا ہے تو بہتا ہی چلا جاتا ہے۔خدا اس دریا کو ہمیشہ رواں دواں رکھے۔

میری تعریف کے بعد وہ کچھ دیر تک خاموش رہے مگر ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ ان کے لب تو خاموش ہوگئے ہیں لیکن ان کے اندرون میں کوئی زبردست مکالمہ چل رہا ہے۔

''کیا بات ہے؟ اچانک آپ اس قدر سنجیدہ کیوں ہوگئے؟'' میرے پوچھنے پر بولے

''بات دراصل یہ ہے سر کہ خلوص ومحبت اور اطاعت وفرماں برداری میں جنگ چھڑ گئی ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں'' میں ان کی طرف غور سے دیکھنے لگا میرے اس سوال پر اپنی نظریں جھکائے ہوئے بولے'' سر آپ کو جو بات پسند نہیں میں وہی کر بیٹھا ہوں مگر قصوروار اکیلا میں نہیں ہوں۔ اس میں میری بیوی بھی شامل ہیں۔ آتے وقت انہوں نے ضد کر کے کہا کہ میں آپ کے لیے اپنے کچن گارڈن سے کچھ تازہ سبزیاں لیتا جاؤں۔ خاص کر پہاری کندرو اور ولائتی کھیرا۔ انہوں نے اس لیے بھی ضد کی کہ ان دنوں بازار کی سبزیوں کے بارے میں طرح طرح کی خطرناک خبریں سننے میں آرہی ہیں سو میں کچھ تازہ سبزیاں لیتا آیا ہوں مگر ہمت نہیں ہو رہی ہے کہ آپ کو پیش کروں''

ان کی باتیں سن کر میرے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی مگر میں سنجیدگی اور سنجیدگی کے درمیان کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا

''جنگ میں محبت کو ہارنا نہیں چاہیے مگر استاد کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ امید ہے آئندہ سے استاد کی نافرمانی نہیں ہوگی۔

''سر آپ بہت اچھے ہیں اس بار نہ صرف یہ کہ آپ نے میری محبت کو مات کھانے سے بچالیا بلکہ مجھے اپنی بیوی کے سامنے شرمندہ ہونے کے احساس سے بھی نجات دلادی۔ سر، اب میں بغیر کسی بوجھ کے اپنے گھر جاسکوں گا۔''

والیہ کو جاتے ہوئے دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ واقعی انہیں کسی دباؤ کے کرب سے چھٹکارہ مل گیا تھا۔

دو روز بعد والیہ صاحب پھر تشریف لائے۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے اپنا موضوع بتایا اور میں شروع ہوگیا۔ گفتگو کے اختتام پر والیہ صاحب کا شگفتہ چہرہ پھر سے اسی سنجیدگی کا شکار ہوگیا جو اس سے پہلے والی ملاقات میں ہوا تھا۔

''لگتا ہے آج پھر آپ کے اندر کوئی جنگ چھڑ گئی ہے؟''

''جی آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ مجھ سے پھر ایک نافرمانی ہوگئی ہے۔ میں یہ نافرمانی نہیں کرتا اس لیے کہ آپ کی پچھلی مٹنگ والی بات میرے ذہن میں اب بھی گونج

رہی ہے مگر آج پانچ ستمبر ہے اور ہمارے درمیان پانچ ستمبر والا رشتہ بن چکا ہے۔ آج کی تاریخ کے رشتے نے مجھے ایسا حوصلہ بخشا کہ میں آپ کی اطاعت کی بھی پرواہ نہ کر سکا لیکن نافرمانی کا احساس بھی مجھے کچوکے لگا رہا ہے۔ اس لیے آج کے دن بھی آپ کو تحفہ پیش کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔''

''والیہ صاحب آپ لوجک اچھی پیش کرتے ہیں آپ کو تو وکیل ہونا چاہیے۔''

''وہ تو میں ہوں سر۔ میں نے L.L.B بھی کر رکھا ہے۔ سر اجازت ہو تو۔۔۔۔۔

''ٹھیک ہے''

''والیہ صاحب نے میرے منہ سے ٹھیک ہے سنتے ہی تھیلے سے تحفہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں شکریے کے ساتھ تحفہ قبول کرتے ہوئے بولا۔

''آج تو میں یہ تحفہ لے لے رہا ہوں مگر یاد رکھیے آئندہ آپ کی کوئی لوجک نہیں چلے گی۔''

''شکریہ، سر! شکریہ، بہت بہت شکریہ!''

ایک دن پڑھائی کے ختم ہونے کے بعد وہ میری طرف بڑی معصومیت اور بیچارگی سے دیکھنے لگے۔

کیا بات ہے میں نے پوچھا تو بولے،

''سر و دیا کا کوئی مول نہیں ہے۔ استاد کے احسانوں کو شاگرد اپنی کھال کی جوتی پہنا کر بھی چکانا چاہے تو بھی نہیں چکا سکتا اور میں جس پرمپرا میں پلا ہوں وہاں گرو کے چرنوں میں تخت و تاج بھی چڑھانے کا رواج رہا ہے یہاں تک کہ گرو دکشنا میں اپنا انگوٹھا تک بھیٹ کیا جاتا رہا ہے مگر میں۔۔۔۔

''کیا آج بھی آپ کچھ لائے ہیں؟''

جی لایا تو ہوں ۔۔۔دراصل میرے ایک عزیز امریکہ سے کچھ ٹائیاں لائے

تھے۔ایک ٹائی پر نظر پڑتے ہی مجھے بے ساختہ آپ یاد آ گئے۔آپ جس رنگ کا لباس پسند کرتے میں اس پر وہ ٹائی بہت جچے گی۔آپ اور آپ کے لباس کی یاد آتے ہی میں نے اس ٹائی کے ڈبے کو آپ کے لیے اپنے تھیلے میں ڈال لیا۔ڈالنے کو تو ڈال لیا مگر_____''ان کا چہرہ مایوسیوں سے بھر گیا۔

''دکھایئے کیسی ٹائی ہے؟''میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی والیہ صاحب نے جلدی سے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ٹائی کا ڈبا باہر نکال لیا اور اُسے کھول کر میری طرف سرکا دیا۔

ٹائی واقعی شاندار تھی اور اس کا رنگ میرا پسندیدہ رنگ تھا۔

''ٹائی تو واقعی بہت خوبصورت ہے''میں نے تعریف کی۔

سر یہ آپ کے گلے سے لگ کر اور بھی خوبصورت ہو جائیگی۔''ان کی مایوسی میں رمق دوڑ آئی۔

''شکریہ،آج کیا پڑھنا ہے؟

''آج غالب کے خطوں کی خصوصیات بتا دیجیے''والیہ صاحب کی آواز سے بھی مایوسی غائب ہو گئی۔

ایک دن پڑھائی کے اختتام پر وہ بولے،

''سر میں سنڈے کو سرہند شریف ماتھا ٹیکنے گیا تھا۔درگاہ سے باہر نکل رہا تھا تو میری نظر ایک دکان کے سامنے بچھی ایک جانماز پر پڑی۔میں اس کی جانب کھنچتا چلا گیا۔ معلوم ہوا مکہ شریف کی بنی ہوئی ہے۔مجھے وہ متبرک جانماز بہت اچھی لگی اور میں نے اُسے بیگم صاحبہ کے لیے لے لی۔آپ بُرا نہ مانیں تو بیگم صاحبہ کی خدمت میں میری طرف سے یہ جانماز پیش کر دیں۔مجھے یقین ہے کہ انہیں بھی یہ جانماز پسند آئے گی۔''اور انہوں نے جانماز کا پیکٹ میری طرف بڑھا دیا۔

''والیہ صاحب یہ سب آپ کیوں کرتے ہیں؟''میں نے پوچھا تو بولے،

''مجھے اچھا لگتا ہے سر! اور سر! تحفے کا رواج تو آپ کے مذہب میں بھی ہے۔ سنتا ہوں تحفے کے لین دین سے قربت بڑھتی ہے۔ اپنائیت کے جذبہ کو فروغ ملتا ہے۔ اس سے خلوص و محبت کی خوشبو پھیلتی ہے۔''

''سو تو ٹھیک ہے مگر اس تحائفی لین دین میں مجھے کچھ اور بوئیں بھی محسوس ہوتی ہیں۔''

''سر میرے تحفے میں اس طرح کی کوئی بو محسوس نہیں ہونی چاہیے۔ میں اسے بڑی عقیدت سے لایا ہوں۔ آپ اگر۔۔۔۔''

''ٹھیک ہے میں انھیں دے دوں گا مگر میں پھر کہہ رہا ہوں کہ یہ سب مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ کل آتے وقت کچھ پچھلے سالوں کے سوال بھی لیتے آیئے گا تا کہ ان کی روشنی میں آپ کی اور بہتر تیاری کرائی جا سکے''۔

''جی بہتر، شکریہ''

چار یا پانچ ملاقاتوں کے بعد والیہ صاحب کے آنے کی رفتار بڑھ گئی۔ اب وہ جلدی جلدی آنے لگے اور ہر بار کوئی نہ کوئی تحفہ بھی لانے لگے۔ کبھی کچن گارڈن کی تازہ سبزی۔ کبھی اپنے باغ کے موسمی پھل۔ کبھی کسی مشہور دکان کی کوئی مشہور مٹھائی۔ کبھی کسی مخصوص بیکری کی اسپیشل بسکٹ۔ کبھی لندن سے آیا ہوا کوئی تحفہ، کبھی ان کی سسرال چندی گڑھ سے آیا کوئی گفٹ، کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ تحفے کے ساتھ وہ اپنی منطق بھی پیش کرتے رہے۔

والیہ صاحب کی معمولات میں فرق صرف یہ آیا کہ وہ دفتر کے بجائے گھر پر آنے لگے۔ یہ تبدیلی انہوں نے کیوں کی یہ بات ٹھیک سے میری سمجھ میں نہ آسکی، البتہ ان کا گھر پر آنا دفتر کے مقابلے میں مجھے زیادہ Comfortable محسوس ہوا۔

وہ روزانہ ٹھیک پانچ سوا پانچ کے درمیان گھر آجاتے۔ وہ ہمیں خصوصاً میرے بچوں اور بیوی کو دور ہی سے دکھائی دے جاتے۔ میرے ڈرائنگ روم کی ایک بڑی کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی تھی جس سے کافی دور تک کا منظر دکھائی دیتا تھا۔

میرے بچوں کی نظر ان پر پہلے پڑتی اور جیسے ہی پڑتی وہ قدرے اونچی آواز میں

اپنی ممّی کو خبر کرتے۔

''ممّی! ممّی! دیکھیے، والیہ انکل آرہے ہیں!''

بچّوں کی آواز سنتے ہی اور کبھی کبھی آواز سے پہلے ہی میری بیوی کھڑکی کے پاس پہنچ جاتیں۔ نظروں کا کھڑکی سے باہر نکلتے ہی اُن کی آنکھوں میں ایک چمک سی دوڑ جاتی اور چہرے پر ایک عجیب طرح کی خوشی کی سی کیفیت ابھر آتی۔ ایک دن جب دیوار گھڑی کی سوئیاں ساڑھے پانچ سے اوپر پہنچ گئیں اور چھوٹی سوئی چھ کے ہندسے کو چھونے لگی تو میری بیوی میرے پاس آکر بولیں:

''والیہ صاحب کہیں باہر گئے ہوئے ہیں کیا؟''

''نہیں تو، کیوں؟'' میں نے ان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا

''چھے بج گئے، ابھی تک وہ آئے نہیں اس لیے۔۔۔۔''

''ممکن ہے کسی وجہ سے دیر ہوگئی ہو یا آج کا پروگرام ملتوی کردیا ہو''

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان کی طبیعت خراب ہوگئی ہو یا خدانخواستہ راستے میں کچھ۔۔۔ آپ فون سے معلوم کیوں نہیں کرلیتے۔''

''ایسی بات ہوتی تو وہ خود ہی فون کردیتے۔''

''آپ کرلیں گے تو کیا چھوٹے ہوجائیں گے؟''

بیوی کے اس جملے پر میں انہیں اور بھی زیادہ غور سے دیکھنے لگا۔

''کچھ دیر اور انتظار کرلیتے ہیں، نہیں آئیں گے تو میں فون کرلوں گا، آپ بے چین نہ ہوئیے''

''بے چین تو آپ کو بھی ہونا چاہیے۔ آپ کے شاگرد ہیں۔ روزانہ کی روٹین ہے، شاگرد کے روٹین میں فرق آجائے تو استاد کو فکرمند تو ہونا ہی چاہیے۔''

مجھے ایسا لگا جیسے انہوں نے میرے دل کی بات کہہ دی ہو۔ والیہ صاحب کی تاخیر سے میرے اندر بھی ایک بے قراری کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی تھی۔

ایک دن بچّوں کی آواز پر میری بیوی کھڑکی کی طرف لپکیں اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں مگر اس دن ان کی آنکھوں میں وہ چمک پیدا نہ ہوسکی جو اکثر والیہ صاحب کو گھر کی طرف آتا دیکھ کر ہوا کرتی تھی۔

والیہ صاحب گھر آکر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کندھے سے تھیلا اتار کر حسب معمول میز پر رکھ دیا مگر بیگ کے علاوہ آج انہوں نے میز پر اور کوئی تھیلا یا پیکٹ نہیں رکھا جیسا کہ ان کا معمول تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے بھی حیرت ہوئی مگر جلد ہی میری حیرت اس پھولے ہوئے بیگ کو دیکھ کر دور ہوگئی جسے ابھی ابھی انھوں نے کندھے سے اتار کر میز پر رکھا تھا۔ میری بیوی والیہ صاحب کے لیے پانی کا گلاس لے آئیں اور اسے میز پر رکھنے لگیں کہ اچانک ان کے چہرے کی بے اطمینانی میں اطمینان کی لہریں ہلکورے مارنے لگیں۔ وہ گلاس رکھ کر چلی گئیں اور ہم اردو ادب کی تاریخ سمجھنے اور سمجھانے میں مصروف ہوگئے۔

''والیہ صاحب! اس سے قبل کہ ہم اردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالیں ہمیں تاریخ کی غرض و غایت کو سمجھ لینا چاہیے، کیا خیال ہے؟''

''بالکل درست خیال ہے سر، انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔

''والیہ صاحب کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ تاریخ ہوتی کیا ہے؟''

''جی ہاں میں بتا سکتا ہوں۔ اتفاق سے کل رات ہی میں نے ایک کتاب میں اس موضوع کا مطالعہ کیا ہے۔ تاریخ کے معنی ہیں گزرے ہوئے واقعات و سانحات کا ذکر۔ میرا مطلب ہے وہ نمایاں واقعات و حادثات جو ماضی میں رونما ہوئے اور جنہوں نے زمانے کے حالات کو متاثر کیا اور جن سے زندگیاں متاثر ہوئیں، ان کا ذکر یا ان کو دوہرانا تاریخ ہے، میں نے صحیح سمجھا ہے نا سر؟''

''والیہ صاحب میرے سوال کا جواب دے کر میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

والیہ صاحب جب تاریخ کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار کر رہے تھے، میری

بیوی جو چائے کی ٹرے لگا رہی تھیں والیہ صاحب کی باتوں کو بڑے غور سے سن رہی تھیں۔

''جی ہاں، آپ نے بالکل صحیح سمجھا۔ بس یوں سمجھیے کہ اردو ادب کے ارتقا میں جو اہم اور نمایاں موڑ آئے ہیں اور جن سے اردو ادب کے سفر میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور ان تبدیلیوں سے اردو ادب کے چہرے پر جو نئے نئے تاثرات مرتب ہوئے ہیں وہی اردو ادب کی تاریخ ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کب کب کہاں کہاں اور کس کس طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ان سے کیا کیا اثرات مرتب ہوئے تو سب سے پہلے ہم دکن کی طرف چلتے ہیں۔

میں نے اردو ادب کی تاریخ پر لیکچر دینا شروع کر دیا۔

تاریخ پر لیکچر کے دوران میری بیوی کسی نہ کسی کام کے لیے ہمارے پاس آ جاتی تھیں اور ان کی نظریں تھیلے پر مرکوز ہو جاتی تھیں۔ جب جب بیوی کی نظریں تھیلے پر مرکوز ہوتیں تب تب کچھ نہ کچھ تھیلے سے باہر نکل کر میرے ذہن میں جمع ہونے لگتا۔

والیہ صاحب جب سے آئے تھے کئی بار تھیلے میں ہاتھ ڈل کر کچھ نہ کچھ نکال چکے تھے لیکن تھیلے کا پھولا ہوا حصہ ابھی تک جیوں کا تیوں بنا ہوا تھا۔

اردو ادب کی تاریخ پر میرا لیکچر ختم ہوا اور آخری بار والیہ صاحب نے جب تھیلے میں ہاتھ ڈالا تو میری بیوی میرے قریب سمٹ آئیں اور ان کی نظریں والیہ صاحب کے اس ہاتھ پر مرکوز ہو گئیں جس کا آدھا حصہ تھیلے کے اندر جا چکا تھا۔ اس وقت مجھے ایک مداری یاد آ رہا تھا جو مجمعے کے درمیان ہر پانچ منٹ کے بعد ڈگڈگی روک کر اپنا ہاتھ اس پٹاری کے اندر ڈال دیتا تھا جس کے اندر کوئی عجیب و غریب سانپ بند تھا۔

والیہ صاحب کا ہاتھ تھیلے سے جب باہر آیا تو انگلیوں میں ایک موٹی سی کتاب دبی تھی۔ والیہ صاحب اس کتاب کی طرف میری توجہ مبذول کراتے ہوئے بولے

''سر، مجھے ایک اچھی کتاب مل گئی ہے۔ میں یہ کتاب آپ کو دکھانے لایا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس میں میرے سارے ٹوپکس کور ہو جا رہے ہیں آپ ذرا ایک نظر اس پر ڈال لیجیے تو مجھے اطمینان ہو جائے گا۔

''کتاب''! یہ لفظ میرے منہ سے اس طرح نکلا جیسے تھیلے سے کتاب نہ نکلی ہو بلکہ کوئی اور چیز باہر آئی ہو۔ میری نظریں اس کتاب میں الجھ گئیں۔

''سر! آپ نے بتایا نہیں کہ یہ کتاب تیاری کے لیے کیسی رہے گی؟''

''اچھی رہے گی، بہت اچھی رہے گی'' میں جلدی جلدی ورق الٹنے لگا۔ ورق گردانی کے دوران مجھے محسوس ہوا جیسے کچھ آنکھیں مجھے غور سے دیکھ رہی ہوں۔

''سر کتاب اچھی ہے نا؟'' والیہ صاحب نے پُر جوش لہجے میں پوچھا۔

''ہاں بہت اچھی ہے'' میں نے والیہ صاحب کے کھلے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا

''سر، اب اجازت دیجیے۔''

''جی، ضرور'' میں نے کتاب والیہ صاحب کی طرف بڑھادی۔

والیہ صاحب نے تھیلا کھولا۔ تھیلے میں کتاب رکھی۔ تھیلے کو بند کیا۔ دونوں ہاتھ جوڑے۔ نمستے کیا اور اطمینان سے کھڑے ہو کر باہر نکل گئے۔

میری بیوی انھیں دور تک اس طرح دیکھتی رہیں جیسے وہ لوٹ کر آنے والے ہوں۔ جب والیہ صاحب پوری طرح نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میری بیوی میرے پاس آ کر بیٹھتی ہوئی بولیں۔

''آپ کے شاگرد کو آج کیا ہو گیا؟''

''کیا ہو گیا کا کیا مطلب؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

''مطلب یہ کہ آپ کو نہیں لگتا کہ وہ آج کچھ ____'' انہوں نے جملہ پورا نہیں کیا۔

''لگتا تو ہے مگر ____'' میں نے بھی جملے کو ادھورا چھوڑ دیا۔

''مگر کیا ____؟'' بیوی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''مگر یہ کہ کوئی وجہ بھی تو ہو سکتی ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''بھلا ایسی بھی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ رٹی رٹائی تاریخ بھی یاد نہ رہے۔''

''امتحان ۔ ،سر پہ امتحان ہوتو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔'' میں نے بیوی کو مطمئن کرنے کوشش کی۔

''امتحان نہیں کتاب! امتحان میں تو سبق اور بھی یاد رہنا چاہیے ورنہ فیل ہو جانے کا خطرہ بنا رہتا ہے۔ آپ تو ماسٹر ہیں کیا اتنا بھی نہیں جانتے؟''

''جانتا ہوں۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کبھی کبھار کچھ بھول جانا چاہیے ورنہ چہرہ ۔۔۔ میں ٹھیک، کہہ رہا ہوں نا؟''

''شاید ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں مگر اس طرح کی نصیحت کیا صرف دوسروں کے لیے ہی ہوتی ہے؟''

''مطلب؟''

''مطلب آپ کے چہرے پر لکھا ہوا ہے۔ نہیں سمجھ میں آ رہا ہو تو باتھ روم میں جا کر اپنا چہرہ دیکھ لیجیے''۔ اور وہ میری طرف گہری نظروں سے دیکھتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

باتھ روم کا آئینہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور میری نظریں آئینہ کے عکس میں گڑتی چلی گئیں۔

مہارشی دد ھیچی

دھاردار لمبے دانتوں، تیز نکیلے سینگوں، زہر آلود گرم سانسوں اور کئی کئی ہاتھ والے دو پائے گنڈاسے اور کمانیں سنبھالے بگولوں کی طرح دھرتی پر ڈولنے لگے۔

دانت گردنوں میں پیوست ہو گئے۔ خون کے فوارے ابلنے لگے۔ سینگوں میں جسم گتھ گئے۔ دست و پا چھٹپٹانے لگے۔ پھونکوں سے دور دور تک پیڑ پودے جھلس کر راکھ ہو گئے۔ گنڈاسوں کے وار سے سروں کا انبار لگ گیا۔ کمانوں سے نکلتے تیر آگ برسانے لگے۔ طوفان اٹھانے لگے۔

اس بربریت اور غارت گری کو دو یہ استر بھی نہ روک سکے۔ شکست خوردہ اور خوف زدہ دیوتا تھکے ہارے گرتے پڑتے بھگوان برہما کی شرن میں پہنچے اور ہانپتے ہوئے بولے۔

''اسروں نے ہمیں پراجت کر دیا مہاراج! ہم ان کے اتپات اور اتیاچار سے دھرتی کو نہ بچا سکے۔ سرشٹی کے وناش کو نہ روک پائے۔ پراڑیوں کے پران کی رکشا نہ کر سکے۔ ان کا آتنک بڑھتا جا رہا ہے مہاراج۔ یدی انھیں روکا نہیں گیا تو دھرتی نشٹ ہو جائے گی سرشٹی مٹ جائے گی''۔

بھگوان برہما کی صاف ستھری پیشانی لکیروں سے اٹ گئی۔ چندن کے چاند نما ٹیکے میں دراڑیں پڑ گئیں۔

برہما نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ من چنتن میں ڈوب گیا۔ بند آنکھوں میں پورب، پچھم، اتر، دکھن ایک ایک کر کے ساری دشائیں ابھریں۔ دشاؤں کے گربھ سے کچھ عکس ابھرے۔ عکس تھوڑی دیر ٹھہرے پھر مٹ گئے۔ آخر میں ایک ایسا عکس ابھرا جو دیر تک رکا رہا۔ اس عکس سے شعائیں پھوٹیں۔ بند آنکھیں روشنی سے بھر گئیں۔ اس روشنی کی جھلک برہما کے ماتھے پر بھی سمٹ آئی۔ چندن کا تڑخا ہوا چاند پھر سے ہموار ہو گیا۔

برہما نے اپنی پلکیں کھول دیں۔ آنکھوں کی کرنوں سے دیوتاؤں کے بجھے ہوئے چہرے بھی جگمگا اٹھے۔

دیر سے چپ سادھے ہوئے بھگوان برہما کے لب بھی وا ہو گئے۔

''آپ لوگ مہارشی دد ھیچی کے پاس جایئے۔ وہی اس سنکٹ کا ندان کر سکتے ہیں''۔

بھگوان برہما کی صلاح پر دیوتا مہارشی دد ھیچی کے پاس پہنچے۔ مہارشی دد ھیچی اپنی کٹیا میں دھیان لگائے بیٹھے تھے۔

دیوتاؤں نے ان سے اسروں کے ظلم و جبر، دھرتی کی تباہی و بربادی، سرشٹی کی تہس نہس اور اپنی لاچاری و بے بسی کی روداد سنائی تو مہارشی دد ھیچی کا سراپا کپکپا اٹھا۔ ان کا دھیان ٹوٹ گیا۔ وہ چنتن منن سے باہر آئے۔

ان کی فکر مند آنکھوں نے دیوتاؤں کے دیدوں میں راکشسوں کے اتپات سرشٹی کے وناش اور چہروں پر خوف و ہراس اور اضطراب کو دیکھا تو ان کی پلکیں کپکپا اٹھی۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ چہرہ اداسیوں سے بھر گیا۔ انھوں نے اپنے پران تیاگ دیے۔

ان کی ہڈیوں سے تین شستر نکلے:

اجگو، گانڈیو اور سارنگ۔

شنکر نے اجگو، اندر نے گانڈیو اور وشنو نے سارنگ اٹھا لیے۔

پھر سے یدھ شروع ہوا۔

راکشسوں کے سردار برتر اسر اور اس کے ساتھی مہارشی ددھیچی کی ہڈیوں سے نکلے شستروں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ان کے وار سے دانوؤں کا بدھ ہو گیا۔

سنکٹ ٹل گیا۔دھرتی ظلم واستبداد سے نجات پا گئی۔سرشٹی غارت گری سے محفوظ ہوگئی۔مخلوقات کے جان ومال کو تحفظ حاصل ہو گیا۔دیوتاؤں کی چنتا بھی دور ہوگئی۔

سنسار چین کا سانس لینے لگا۔

مگر سمے کے کال چکر نے پھر سے اپنا چکر چلا دیا۔

دانو پھر سے دھرتی پر ڈولنے لگے۔

قتل وخون کا بازار گرم ہو گیا ۔ہری بھری وادیاں ملیامیٹ ہونے لگیں۔ جان ومال تباہ وبرباد ہونے لگے۔راکشسوں کی نوچ کھسوٹ،بربریت،دہشت گردی اور غارت گری سے ماحول پھر سے انتشار واضطراب کا شکار ہو گیا۔چاروں طرف ہاہا کار مچ گئی۔چیخ وپکار اور درد وکراہ سے زمین وآسمان دہلنے لگے۔

دیوتاؤں نے ظلم وجبر کو روکنا چاہا مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔مدد کے لیے بھگوان برہما کے پاس پہنچے۔

روداد سن کر بھگوان برہما کی پیشانی پر لکیریں ابھریں۔

لکیریں گہری ہوئیں

چندن کا ٹیکا تڑخا

آنکھیں بند ہوئیں

بند آنکھوں میں بہت سارے عکس ابھرے

مٹے

آخر کار ایک عکس ٹھہر گیا

اس عکس کے ٹھہرتے ہی بھگوان برہما کے ہونٹ کھل گئے:

''مہارشی ددھیچی کے پاس جایئے۔وہی اس سنکٹ سے مکتی دلا سکتے ہیں''۔

''پرنتو مہارشی دد ھیچی تو کب کے پران تیاگ چکے ہیں مہاراج!''

دیوتاؤں نے برہما کو یاد دلایا۔

بھگوان برہما سر ہلاتے ہوئے نہایت پر اعتماد لہجے میں بولے۔

''یہ ستیہ ہے کہ مہارشی دد ھیچی نے اپنے پران تیاگ دیے تھے پرنتو کیا یہ سمبھو نہیں ہے کہ جس پرکار اسروں نے پنر جنم لیا ہے مہارشی دد ھیچی نے بھی پنر جنم پراپت کیا ہو؟''

''اوشیہ سمبھو ہے مہاراج!'' دیوتاؤں نے ایک آواز ہو کر بھگوان برہما کی بات کی تائید کی۔

''تو پھر جایئے، مہارشی دد ھیچی کو ڈھونڈ یے، ولمب مت کیجیے انیتھا۔۔۔

''مہاراج ہم انھیں پہچانیں گے کیسے؟'' ایک کم عمر دیوتا نے سوال کیا۔

''آپ کا پرشن اچت ہے۔ برہما نے اس کم عمر دیوتا کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''دھنیہ واد مہاراج!''

''مہارشی دد ھیچی دھیان میں لین ہوں گے۔ مکھ پر تیج اور آکرشن ہوگا۔ آس پاس کا واتاورن پرکاش مے ہوگا۔ وہاں ادبھت درشیہ دیکھنے کو ملیں گے۔ آپ کی بات سن کر وہ ویاکل ہوا ٹھیں گے۔ ان کا ماتھا چنتا کی ریکھاؤں سے بھر جائے گا، انتتہ وہ اپنے پران تیاگ دیں گے''۔

بھگوان برہما سے پہچان کی تفصیل سن کر دیوتا مہارشی دد ھیچی کی تلاش میں نکل پڑے۔ ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے وہ ایک مٹھ پر پہنچے۔ مٹھ کا ماحول ایک عجیب طور کے نور سے معمور تھا۔ مٹھ کے صحن میں ایک دلکش چبوترہ تھا۔ اس چبوترے پر ایک رشی دھیان لگائے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ ماتھے پر چندن کا ٹیکا اس طرح چمک رہا تھا مانو چندرما ان کے للاٹ پر خود براجمان ہو۔

انھیں دیکھ کر دیوتاؤں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

دیوتاؤں نے مہارشی ددھیچی کی طرف اپنا منھ کر کے نہایت دردناک لہجے میں راکشسوں کے ظلم وستم کا حال سنایا۔ دھرتی پر سرشٹی کی تباہی و بربادی کی روداد بیان کی مگر رشی کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ انھوں نے بار بار اپنی روداد دہرائی۔ پھر بھی رشی کا دھیان نہیں ٹوٹا۔ رشی اپنے چنتن منن سے باہر نہیں نکلے۔ ان کے بدن میں کپکپی نہیں پیدا ہوئی۔ ان کے پران ان کے جسم سے الگ نہیں ہوئے۔

دیوتا وہاں سے ناامید اور مایوس ہو کر ایک اور رشی کے پاس پہنچے۔ اس رشی کا مٹھ بھی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ ان کے مکھ سے بھی تیج پھوٹ رہا تھا۔ وہ بھی دھیان میں مستغرق تھے۔ ان کو بھی دیوتاؤں نے اپنا حال سنایا۔ بار بار سنایا لیکن ان کا دھیان بھی بھنگ نہیں ہوا۔ انھوں نے بھی اپنے پران نہیں تیاگے۔

دیوتا ایک اور رشی کے پاس گئے۔ وہاں بھی انھیں مایوسی ہاتھ آئی

دیوتا ایک ایک کر کے روئے زمین پر موجود ان تمام رشیوں کے پاس گئے جن کے اندر وہ نشانیاں موجود تھیں جنھیں بھگوان برہما نے بتائی تھیں مگر کسی بھی رشی کا دھیان نہیں ٹوٹا۔ کسی نے پران نہیں تیاگے۔

چاروں طرف سے مایوس ہو کر دیوتا دوبارہ بھگوان برہما کے پاس پہنچے۔

''کیا بات ہے؟'' بھگوان برہما نے ان کی حالت کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مہاراج! مہارشی ددھیچی نہیں ملے''۔

''ہاں مہاراج، ہم ایسے سارے رشیوں کے پاس گئے جو دھیان میں لین تھے، جن کے مکھ پر تیج تھا۔ جن کے واتاورن میں پرکاش گھلا ہوا تھا پر نتو کسی کا بھی دھیان نہیں ٹوٹا۔ کسی کے بھی مکھ پر چنتا کی ریکھائیں نہیں ابھریں کسی نے اپنے پران نہیں تیاگے''۔

بھگوان برہما کے ماتھے کا چندنی چاند تڑخ گیا۔ دھیرے دھیرے ان کی پلکیں بند ہوتی چلی گئیں۔

بند پلکوں میں مہارشی ددھیچی ابھر آئے۔

دد ھیچی جو ایک منش تھے، جنھوں نے اپنی کڑی تپسیا اور گھور سادھنا سے سدھی پراپت کر لی تھی،

جو اپنے

جپ سے

تپ سے

دھیان اور گیان سے

مہارشی اور مہان بن گئے تھے

جنھوں نے اپنے

لیس سے

اگنی کو

وایو کو

ورشا کو

جل کو

تھل کو

آکاش کو

پاتال کو

سب کو

اپنے بس میں کر لیا تھا

دد ھیچی جن کی ہڈیوں میں وجر باس کرتے تھے

اجگو، سارنگ اور گانڈیو بستے تھے۔

''کیا کوئی ایسا رشی نہیں دیکھا جس کے پاس اگنی، وایو، ورشا، جل آکاش، پاتال اتیادی دکھائی دیئے ہوں''۔ اپنی پلکیں کھولتے ہوئے برہما نے سوال کیا۔

''ایک رشی ایسے اوشیہ دکھائی دیئے مہاراج جن کی انگلی کے سنکیت سے چمتکار اتپن ہورہے تھے''۔

''کیا؟''

''ہاں مہاراج!''

''تنک وستار سے بتایئے''۔

''ایک بہت شانت، شیتل، سندر، سکھد استھان پر انوٹھے بھیس بھوشا میں ایک رشی چمچماتے ہوئے چبوترے پر آسن لگائے بیٹھے تھے۔آنکھیں بند تھیں۔ ماتھے سے تیز کرنیں نکل رہی تھیں۔ایک ہاتھ میں ہیرے کے دانوں والی مالا تھی جسے ان کی انگلیاں تیز گتی سے پھیر رہی تھیں۔ رشی دھیان میں بیٹھے بیٹھے اپنے دوسرے ہاتھ کی انگلی وِبھن دشاؤں میں اٹھاتے اور انگلی کے اٹھتے ہی ادبھوت درشیہ دکھائی دکھائی دینے لگتے۔

کبھی وہ اپنی انگلی کا سنکیت اس اگنی کی اور کرتے جو ایک ہون کنڈ میں دھدھک رہی تھی۔سنکیت پاتے ہی اگنی ترنت بجھ جاتی مانو ہون کنڈ میں اگنی ہو ہی نہیں اور کبھی سنکیت پاکر اس کنڈ کے بھیتر سے جوالا بھڑک اٹھتا۔اسی پرکار انگلی اوپر اٹھتی تو آکاش سے کبھی ورشا ہونے لگتی تو کبھی پتھر برسنے لگتے اور کبھی شستر اور استر گرنے لگتے۔انگلی نیچے جھکتی تو دھرتی سے پانی کا فوارہ ابل پڑتا۔کبھی انگلی کے سنکیت سے وایو تیبر گتی سے بہنے لگتی اور کبھی رک جاتی۔ وہاں اور بھی بہت سارے ادبھوت درشیہ اور چمتکار دیکھنے کو ملے مہاراج!''

''تو کیا انھوں نے بھی اپنا دھیان نہیں توڑا؟''

''نہیں مہاراج! ان کا دھیان بھی نہیں ٹوٹا''۔

بھگوان برہما کی آنکھیں پھر بند ہوگئیں۔

بند آنکھوں میں برہمانڈ سمٹ آیا۔

برہمانڈ کے ماتھے پر ریکھائیں ابھرنے لگیں

ریکھائیں جنھیں خود برہما نے کھینچی تھیں

مگر برہما کی آنکھیں انھیں پڑھنے سے قاصر تھیں۔

محبت کے رنگ

میرے سینے کے درد کی دھمک ثمینہ کی سماعت تک پہنچ گئی۔ دہکتے ہوئے انگاروں سے بھری انگیٹھی اور درد مٹانے والے تیل کی شیشی لیے شمینہ آنا فانا میرے پاس آدھمکی۔

''ماسٹر صاحب! بٹن کھولیے، تیل مالش کردوں۔''

میں جھجکا تو خود اسکی انگلیاں میری قمیض کے بٹنوں تک پہنچ گئیں۔

''رہنے دو ثمو! کچھ دیر میں درد یونہی چلا جائیگا۔''

''یونہی کیسے چلا جائیگا۔ درد یونہی چلا جاتا تو پھر یہ دوائیں کیوں ایجاد ہوتیں؟ تکلف نہ کیجیے۔ ہاتھ ہٹائیے اور مجھے اپنا کام کرنے دیجیے۔''

''بے کار میں تم ضد کر رہی ہو۔''

''ضد میں نہیں، آپ کر رہے ہیں، پلیز ہاتھ ہٹائیے، ورنہ درد بڑھتا چلا جائیگا اور اگر خدانہ خواستہ درد زیادہ بڑھ گیا تو اس وقت کوئی ڈاکٹر بھی نہیں ملے گا۔''

ثمینہ کی انگلیوں نے میرے ہاتھ کو قمیض سے الگ کر دیا اور خود بٹن کھولنے میں مصروف ہوگئیں۔

قمیض کے دونوں سرے میرے دونوں پہلوؤں کی جانب کھسک گئے۔ گرم تیل اور خلوص میں ڈوبی ثمینہ کی نرم گرم انگلیاں میرے مضطرب سینے پر تیزی سے پھرنے لگیں۔ آہستہ آہستہ درد سرکنے لگا۔ دردمند انگلیوں کے خلوص نے میری نگاہوں میں ایک

پیکر ابھار دیا۔ یہ وہ پیکر تھا جو اکثر ایسے موقعوں پر میرے پاس سمٹ آتا تھا اور جس کے آتے ہی درد سرک کر کہیں دور چلا جاتا تھا۔ اس پیکر کا لمس رگ و ریشے میں سکھ بھر دیتا تھا۔ یہ وہ پیکر تھا جو ایک حادثے میں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا تھا اور مجھے اپنے قرب سے ہمیشہ کے لیے محروم کر گیا تھا۔

ممتا اور محبت کے اس پیکر کے کھونے اور اپنے خالی ہو جانے کا سارا کرب میری آنکھوں میں سمٹ آیا۔ روشن دیدوں میں پانی بھر آیا۔ پیکر اس پانی میں ڈوب گیا۔ دیر تک میں رومال سے نم آلود اور بوجھل پلکوں کو صاف کرتا رہا۔ رومال ہٹا تو میری نگاہوں نے دیکھا کہ ثمینہ کی نظریں میری آنکھوں پر مرکوز تھیں۔ وہ یک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھی جیسے وہ کچھ تلاش کر رہی ہو اور اسکی نرم گرم انگلیاں اور بھی مستعدی سے میرے سینے پر پھر رہی تھیں۔ اسکی متلاشی آنکھیں اور رقص کناں انگلیاں دونوں مجھے اچھی لگیں۔ میری نگاہیں متلاشی آنکھوں پر مرکوز ہو گئیں۔ اس بار وہ مجھے پراسرار بھی لگیں۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوا جیسے وہ میرے اندر اترتی جا رہی ہوں اور شاید کچھ کہنا بھی چاہ رہی ہوں۔ میں دیر تک ثمینہ کی آنکھوں کی پراسراریت کو پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اچانک میرے ذہن میں عجیب و غریب قسم کے خیالات ابھرنے لگے۔ پہلے تو میں ان خیالوں کو ادھر ادھر جھٹکتا رہا۔ بعد میں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہم اس کمرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور ہمارے اردگرد کی ایک ایک چیز کا رنگ بدلتا جا رہا ہے۔

تمھارا ذہن کہاں بھٹکنے لگا اشفاق؟ تم یہ کیا کیا سوچنے لگے؟ میرے اندر کی ایک آواز مجھے روکنے لگی۔

تم کس کی باتوں میں آ رہے ہو؟ آج جب ایک حقیقت تمھارے سامنے آ گئی ہے اور تمھیں محسوس ہونے لگا کہ سامنے والی آنکھیں تمھیں کسی اور رنگ میں دیکھ رہی ہیں تو تمھارا یہ سوچنا کوئی غیر فطری عمل نہیں ہے۔

دوسری آواز مجھے آگے بڑھنے کا جواز فراہم کرنے لگی۔

''مگر۔۔۔۔۔۔۔۔'' پہلی آواز نے بات شروع ہی کی تھی کہ دوسری آواز اسکی تردید میں بول پڑی۔

''مگر کیا؟ یہی نہ کہ اس نئی سمت میں اڑنا اٹ پٹا تگ لگ رہا ہے۔ یہ اٹ پٹا پن بہت دیر تک باقی نہیں رہے گا۔ نئے احساس کا فطری پن اس کے بند کو بہت جلد توڑ دے گا۔

دوسری آواز کی اس دلیل کے بعد میری نگاہوں کے پھیلاؤ کا دائرہ بڑا ہوگیا۔ ثمینہ کی آنکھوں کا رنگ اور گہرا اور گاڑھا نظر آنے لگا۔ دیدوں کے آئینے میں کچھ منظر بھی چمکنے لگے:

''ماسٹر صاحب! لائیے اپنے کپڑے دیجیے، میں دھودوں۔''

''میرے میلے کپڑے دھوؤ گی؟''

''کیا میں اپنے میلے کپڑے نہیں دھوتی؟''

''پھر بھی''

''تکلف نہ کیجیے۔ جلدی سے دے دیجیے، نہیں تو آنگن سے دھوپ نکل بھاگے گی۔''

'' مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں۔۔۔۔۔۔۔

''مگر مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں، آپ کا کام کر کے مجھے خوشی ملتی ہے۔''

''ماسٹر صاحب! یہ پھول آپکے لیے۔۔''

''میرے لیے کیوں؟''

''آپ کو پھول بہت پسند ہیں نا اس لیے۔ بازار گئی تھی تو سب کے لیے کچھ نہ کچھ لائی۔ آپ کا خیال آیا تو یہ پھول نظر آگئے۔ اچھے ہیں نا ؟''

''اشفاق! تمھیں معلوم ہے ثمینہ نے یہ فرنی کیوں بنائی ہے؟''

''کیوں بنائی ہے امّی جان؟''

''تمھاری کامیابی کی خوشی میں، کلاس میں تم اوّل جو آئے ہو نا۔''

''لیکن یہ کامیابی ایسی بھی نہیں کہ جشن منایا جائے۔''

''کیوں، ایسی کیوں نہیں ہے ماسٹر صاحب! ہمارے لیے یہ بہت بڑی خوشی کی بات ہے۔ میرا بس چلتا تو میں اس خوشی کو خوب دھوم دھام سے مناتی۔''

منظروں کے آس پاس ثمینہ کا وہ چہرہ بھی ابھر آیا جس پر ہیڈ لائٹس کی طرح موجود اس کی بڑی بڑی معنی خیز آنکھیں مختلف موقعوں پر میری جانب مرکوز ہوتی رہی ہیں۔ شاید کچھ بولنے یا بتانے کی کوشش کرتی رہی ہیں مگر میں اسکی نگاہوں کی زبان کو نہ سمجھ سکا۔ انکی معنی خیزی کا مفہوم نہ پا سکا۔

میری نظروں کے سامنے ابھرے مناظر اور ثمینہ کے نظروں کے اسرار دونوں مل کر میرے آگے معنی کے در وا کرنے لگے۔ پھر سے چیزوں کا رنگ بدلنے لگا۔ رنگ سے پھوٹنے والی شعاعوں نے میرے ذہن کے آگے منڈرانے والے دھندلکوں کو دور کر دیا۔

ثمینہ ایک نوجوان، خوبصورت اور پرکشش لڑکی کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔ اس کے خط و خال، رنگ روپ، نشیب و فراز، لب و رخسار، قد و قامت سبھی مجھے اچھی طرح دیکھائی دینے لگے۔ اس کے اس نئے روپ کی جلتی ہوئی تیلیوں نے میرے جسم کے چراغوں کو روشن کر دیا۔ آہستہ آہستہ لویں اٹھنے لگیں۔ اٹھتی ہوئی لوؤں کی روشنی میں میں اوپر اڑنے لگا۔ میرے ساتھ ثمینہ بھی اڑنے لگی۔ اڑتے اڑتے ہم ایک ایسے گھر میں پہونچ گئے جہاں در و دیوار سے جاں فزائی نور پھوٹ رہا تھا۔ طلسماتی رنگ ابھر رہا تھا۔ ماحول سحر ساز خوشبوئیں بکھیر رہا تھا۔ فضا میں ایک کیف آگیں موسیقی گھل رہی تھی۔ میں کم خواب کے بستر پر پڑا تھا اور جوان خوبرو ثمینہ میرے کھلے ہوئے چوڑے چکلے سینے پر اپنی نرم گداز انگلیوں

سے گرم گرم تیل مالش کر رہی تھی اور میرا خواب کسی داستانوی شہزادے کی طرح اڑان بھرتا جا رہا تھا۔

''ثمو! گیارہ بج گئے، سوئے گی نہیں؟''

نچلی منزل سے ثمینہ کی ممی کی آواز آئی اور خواب بکھر گیا۔

ثمینہ چلی گئی اور میں خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔

میرے پاس سے جا چکی ثمینہ ایک نئے روپ میں پھر سے میرے قریب آدھمکی۔ اسکی جادوئی آنکھوں نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا اور اس کے یاقوتی لب کچھ بولنے کے لیے مچلنے لگے۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتے ہوں:

میری آنکھوں کی زبان تو ناکام ہو ہی گئی تھی، لگتا ہے انگلیوں کی زبان بھی اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو پائی۔ میں کیا کروں کہ زبان کھولے بنا میرے دل کا حال آپ کے دل تک پہنچ جائے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں ایک عورت ہوں اور عورت اس معاملے میں اپنے لب نہیں کھولتی۔

اچھا ہوا کہ میرے دل کی بات آپ تک پہنچ گئی ورنہ پتا نہیں میرا کیا حال ہوتا؟ میرا اضطراب مجھے کس کس کرب سے گزارتا؟ مجھ میں درد کی کتنی فصلیں اگاتا؟ کب تک مجھے کانٹوں کے بستر پر سلاتا؟ مجھے ان لذتوں اور مسرتوں سے محروم رکھتا جن سے میں ان دنوں سرشار ہوں۔

''ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔ اٹھیے جلدی کیجیے۔ آج ہمیں تھاوے کی دیوی کا میلہ دیکھنے جانا ہے۔ آج کا میلہ میں آپ سے دیکھونگی۔ دیکھائیں گے نا؟ اس میلے میں لڑکیوں کے مطلب کی بہت ساری چیزیں آتی ہیں۔ جیب گرم کر کے چلیے گا۔ اور ہاں، سنا ہے اس بار کوئی مشہور نوٹنکی پارٹی آئی ہوئی ہے۔ روز پیار محبت کا کھیل دیکھا رہی ہے۔ آج

شیریں فرہاد کا کھیل دکھانے والی ہے۔ کسی طرح باجی وغیرہ کو گولی دے کر ایک دو گھنٹے کے لیے ان سے الگ ہو جائیں گے۔ بڑا مزہ آئے گا۔ میں چلتی ہوں، آپ تیار ہو کر نیچے آجایئے۔

خیالوں کے سحر نے ایسا سماں باندھا کہ دل و دماغ نے میرے ہاتھ میں کاغذ قلم تھما دیا:

خط لکھ کر مجھے ایسی سرشاری ملی جیسے یہ خط ثمینہ نے مجھے لکھا ہو۔ میں نے اسے کئی بار پڑھا اور پھر تہہ کر کے اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد تکیے کے نیچے دبا خط میرے تکیے کو آہستہ آہستہ اوپر اٹھاتا گیا۔ تکیے کے ساتھ ساتھ میں بھی اوپر اٹھتا گیا اور پھر اڑن تشتری کی طرح وہ مجھے خلاؤں میں ادھر ادھر اڑانے لگا۔

ثمینہ کے تئیں میرے سینے میں جاگے اس نئے احساس نے ایسا مرہم لگایا کہ درد ایک بار بھی اپنا سر نہ اٹھا سکا۔ صبح سے شام تک تو درد کو ڈاکٹر کی دوا نے روکے رکھا مگر رات آتے ہی میرے منھ سے کراہ نکلنا شروع ہوگئی۔

ثمینہ آگ اور تیل لے کر پھر میرے کمرے میں آگئی۔

اسے دیکھتے ہی میری کراہ میں اور تیزی آگئی۔

''کیا بات ہوگئی ماسٹر صاحب! دن میں تو درد نہیں تھا؟'' وہ میری طرف حیران و پریشان ہو کر دیکھنے لگی۔

''پتہ نہیں، یکا یک درد کیوں بڑھ گیا؟'' مختصر سا جواب دیکر میں خاموش ہوگیا۔

''آپ نے ڈاکٹر کو دکھایا تھا؟'' میرے سرہانے بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''دکھایا تو تھا اور ڈاکٹر کی دوا سے درد تھم بھی گیا تھا مگر اس وقت پھر۔۔۔۔ میرا لہجہ بھی درد سے بھر گیا۔

''گھبرانے کی بات نہیں ہے۔کل ڈاکٹر کو پھر دکھا لیجیے گا۔اس وقت میں تیل کی مالش کردے رہی ہوں۔اس سے درد ضرور کم ہو جائے گا۔''

''تم کیوں تکلیف اُٹھاتی ہو ثمو! دوا کھالی ہے کچھ دیر بعد تھوڑا بہت درد کم ہو ہی جائے گا،تم جاؤ! سو جاؤ!'' سارا دن کام کرتی رہی ہو تھک گئی ہونگی۔''

کہنے کے لیے میں نے ثمینہ سے جانے کے لیے کہہ دیا تھا مگر دل ڈر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ثمو واپس چلی جائے۔ایک بار وہ کسمسائی تو محسوس ہوا جیسے جانے کے لیے اٹھ رہی ہو۔اس وقت مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا اور جی میں آیا کہ میں اپنے دماغ کے اس حصے کو کسی مضبوط شکنجے میں کس دوں جو خواہ مخواہ کی فارملیٹیز نبھاتا رہتا ہے۔

''نہیں ، میں بالکل نہیں تھکی ہوں اور تھکی بھی ہوتی تو میری تھکن آپ کے درد سے زیادہ اہم تو نہیں ہوتی۔'' یہ کہہ کر ثمینہ میرے سینے پر مالش میں مصروف ہوگئی،ثمینہ کے اس جملے نے میرے رگ وریشے میں کیف وانبساط کا نشہ گھول دیا۔

آج بھی وہ میرے چہرے کی طرف یک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔میں بھی اس کی نظریں بچا کر کبھی کبھی اس کے سراپے کو دیکھ لیا کرتا تھا۔جی چاہ رہا تھا کہ وہ یونہی ساری رات میرے پاس بیٹھی رہے۔اس کی نرم گرم انگلیاں میرے سینے پر رقص کرتی رہیں۔مجھ میں حرارت دوڑتی رہے۔اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی رہیں اور میری نگاہیں اس کے سراپے کا طواف کرتی رہیں اور اس جاں بخش رات کی کبھی صبح نہ ہو۔

کافی وقت گذر گیا۔نہ میں نے اس سے جانے کے لیے کہا،اور نہ ہی اس نے مجھ سے اجازت طلب کی۔ہم دونوں خاموشی سے اپنے اپنے کام میں مشغول رہے۔

نیچے سے ثمینہ کی امی کی آواز آئی اور ثمینہ کے لب بول پڑے

''جاؤں؟''

''جاؤ!'' یہ لفظ میرے منھ سے اس طرح نکلا جیسے میں نے یہ کہا ہو کہ ''مت جاؤ۔''

ثمینہ جانے لگی تو میرے تکیہ کے نیچے پڑے خط نے مجھے ایک بار پھر ٹہوکا دیا۔ وہ پہلے بھی کئی بار ٹہوکے دے چکا تھا مگر میں ہر بار اسے ٹالتا رہا تھا۔ لیکن اس مرتبہ اس کے ٹہوکے پر خاموش رہ جانا میرے بس میں نہیں تھا۔ یکا یک میرے منہ سے نکل گیا۔ ''سنو!''

اس کے قدم رک گئے۔

''کیا بات ہے؟'' وہ میری طرف حیران ہو کر دیکھنے لگی۔

''یہ لو، اسے پڑھ لینا۔'' جلدی سے میں نے وہ خط تکیے کے نیچے سے نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ چند لمحے تک وہ حیرانی کے عالم میں مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اسکی انگلیوں نے میرے خط کو اپنی مٹھی میں دبا لیا۔ میں اسے آخری زینے تک دیکھتا رہا۔

خط میرے تکیے کے نیچے سے جا چکا تھا مگر میرے سر میں ایک اضطراب پیدا کر گیا تھا۔ دماغ کے خانوں میں طرح طرح کے خیالات جمع ہو کر ہلچل مچا رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی کرشمہ ہو جائے اور آن کی آن میں یہ رات صبح میں تبدیل ہو جائے یا صبح کے بجائے رات میں ہی میرے خط کا جواب مل جائے۔ دل کے کسی گوشے میں رہ رہ کر یہ امید بھی انگڑائی لے رہی تھی کہ ممکن ہے خط پڑھنے کے بعد ثمینہ کسی بہانے سے اوپر آ جائے۔

اس اضطراب نے مجھے صبح تک جگائے رکھا۔ ایک لمحہ بھی مجھے چین لینے نہیں دیا۔ خدا خدا کر کے رات کی سیاہی ہٹی اور صبح کی سفیدی نمودار ہوئی تو میں تیار ہو کر وقت سے پہلے ہی ناشتے کی میز پر جا بیٹھا۔ اس وقت کا انتظار رات کے اضطراب سے زیادہ بھاری پڑ رہا تھا۔ ثمینہ جب نظر آئی تو انتظار کا بھاری سل تو ہٹ گیا مگر ایک عجیب طرح کی بے قراری نے مجھے دبوچ لیا۔ ثمینہ قدرے سست رفتار سے میرے پاس پہنچی۔ نظریں نیچی کیے ہوئے اس نے مجھے سلام کیا۔

وہ ناشتے کی پلیٹوں کے ساتھ میز پر ایک لفافہ بھی رکھ کر چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی میں نے لفافہ کھول لیا۔

محترم ماسٹر صاحب!

تسلیم

آپ نے لکھا ہے کہ میں تمھیں نہیں سمجھ سکا تو واقعی آپ مجھے نہیں سمجھ سکے۔ آپ نے اپنے چہرے پر جمی میری آنکھیں دیکھ کر اور ان میں محبت کی جھلک محسوس کر کے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے لیکن آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ آپ پر مرکوز ہونے والی میری نگاہیں خلوص اور محبت سے بھری ضرور تھیں مگر وہ ایک بہن کی آنکھیں تھیں جو اپنے بھائی کے چہرے پر پھیلے ہوئی اداسیوں کے ڈورے اور بھیگی ہوئی آنکھوں میں تیرتے ہوئے غموں سے اس کی زندگی کے خلاء اور محرومیوں کا اندازہ کر رہی تھیں۔ افسوس کہ میں آپ کی خواہش کی تکمیل نہیں کر سکتی۔

آپ کی بہن

ثمینہ

ثمینہ کا خط پڑھ کر مجھے لگا جیسے کسی نے میرے ذہن پر ہتھوڑا مار دیا ہو مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوا جیسے اس ہتھوڑے کی ضرب سے چھٹکی چنگاریوں نے میرے رگ و ریشے میں ایک نئی قسم کی محبت کی گرماہٹ بھر دی ہو۔

آبیاژہ

تگ ودو کے بعد بھی کنواں جب پیاسوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو کسی گہرائی سے زوردار قہقہے بلند ہوئے۔ جیسے کوئی اپنی طاقت اور دوسرے کی ہزیمت کا احساس دلا رہا ہو۔

پیاس، یاس اور شکست کے احساس نے پیاسوں کو ایسا مضطرب اور مشتعل کیا کہ ان کے چہرے کی زردیوں میں بھی سرخیاں لپلپانے لگیں۔ ان کے اندر کا ہیجان باہر بھی نظر آنے لگا۔ ان کا سراپا ہیبت ناک بن گیا۔

وہ وہاں سے اس طرح نکلے جیسے وہ ساری کائنات کو روند ڈالیں گے۔ سب کچھ توڑ پھوڑ کر رکھ دیں گے۔ ان کی آنکھوں کی چنگاریاں سب کچھ جلا کر راکھ کر دیں گی۔ ان کے سخت جبڑے خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ ان کی تنی ہوئی بھویں اپنے تیر چلا کر رہیں گی۔ ان کے بھینچے ہوئے ہونٹ چپ نہیں رہیں گے۔ ان کے مشتعل ہاتھوں کے پتھر رکیں گے نہیں۔ یوں ہی برستے رہیں گے اور راہ میں آنے والوں کے سر پھوڑتے رہیں گے۔

یکبارگی قہقہے خاموش ہو گئے۔ زعفران زار ماحول پر سکوت طاری ہو گیا۔ جیسے قہقہوں پر فالج گر گیا ہو۔ یا کسی نے قہقہہ لگانے والے کی گردن دبا دی ہو۔

پیاسے پتھر اچھالتے اور زمین کو روندتے ہوئے مختلف سمتوں میں آگے بڑھتے چلے گئے۔

''اے خلاؤں میں پتھر اچھالنے اور آنکھوں سے آگ برسانے والے نوجوانِ

شرر بار! اے اپنے ہی ہاتھوں جانِ عزیز کو زِک پہنچانے اور اپنا مال ومتاع لٹانے والے مسافرِ جاں نثار!''

اچانک کوہساری فضا کے سینے سے آبشاری آواز پھوٹ پڑی۔ صحرا زدہ سماعت میں گلستانی صوت وصدا نے آہنگِ سحر ساز بھر دیا۔

سحر البیانی نے ایک نوجوان کا راستہ روک دیا۔ پتھر اچھالنے والے مشتعل ہاتھ ٹھٹھک گئے۔ نگاہیں آواز کے تعاقب میں بھٹکنے لگیں۔

''آنکھوں کو زحمت نہ دو۔ میں تم سے دور نہیں ہوں۔ میں تو تمہارے اتنے قریب ہوں کہ تم چاہو تو میرا لمس محسوس کر سکتے ہو۔''

نوجوان کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔ اس کے دیدوں کے گرم شیشے نرم پڑ گئے۔ سانسوں میں جاں بخش خوشبو بسنے لگی۔ کھولا ہوا دماغ لمسِ کیف آگیں سے ٹھنڈا ہونے لگا۔

''واقعی'' تم ضرور کہیں میرے آس پاس ہی موجود ہو اور میں تمھارا لمس بھی محسوس کر رہا ہوں۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ تم کون ہو مگر تمھاری آواز اور خوشبو سے محسوس ہوتا ہے کہ تم جو بھی ہو میرے لیے باعثِ انبساط ہو۔ کیا میں اس دل نشیں آواز اور فرحت بخش خوشبو کے منبع کو دیکھ سکتا ہوں؟''

''کیا اتنا کافی نہیں کہ میں تمھارے قریب ہوں اور تم مجھے اچھی طرح محسوس کر رہے ہو۔''

''نہیں، یہ کافی نہیں ہے۔ میں جلد سے جلد اُس آواز اور خوشبو کے مرقعے کو دیکھنا چاہتا ہوں جس نے میری پیاس اور یاس دونوں کو کم کر دیا ہے اور شاید میرے غُصّے... اگر یہ ممکن ہے تو براہِ کرم میرے سامنے آؤ اور اپنا جلوہ دکھاؤ۔''

''تمھارے لیے سب کچھ ممکن ہے نوجوان! اس لیے نہیں کہ تم ایک مخلوقِ اشرف ہو۔ خوبرو اور نوجوان ہو بلکہ اس لیے کہ تمھارے مشتعل ہاتھوں کے پتھر اور مضطرب پیروں

کے ٹھوکر تمھیں پراسرار بناتے ہیں۔ تمھارے سینے کے شور اور رگ و ریشے کے زور کا قصہ سناتے ہیں۔ تمھاری شررفشاں آنکھیں ہمارا دامنِ دل کھینچتی ہیں۔ ہمارا راستہ روکتی ہیں۔ تمھارا اشتعال ہمارے تجسّس کو بڑھاتا ہے۔ ہمارے جذبۂ شوق کو بھڑکاتا ہے اور اس لیے بھی کہ تم ایک قدر شناس نوجوان ہو۔ تمھیں لذتِ لمس اور قدر و قیمتِ صوت کی پہچان ہے۔ تمھیں شوقِ نظارۂ رنگ و نور بھی ہے اور ذوقِ جمال یار کی لطف اندوزی کا شعور بھی۔ لو، دیکھ لو! میں پوری طرح بے حجاب ہوگئی۔ فضائے غیر مرئی سے نکل کر جہان مرئی میں آ گئی۔

آواز کے رکتے ہی خلا کے بطن سے ایک خوبصورت خلد آشیاں مخلوق خندۂ زیرِ لبی کے ساتھ مثلِ خورشید طلوع ہوگئی۔ آن کی آن میں ایک مصفّا، مجلّی، منوّر اور مشکبار حسن مدارات محبوبانہ میں مشغول ہوگیا۔ رنگ و نور اور کیف و سرور کی بارشیں شروع ہوگئیں۔

بیاباں گزیدہ نوجوان اس جمالِ جاں نواز کی جلوہ آرائی میں کھوگیا۔ اس کی تشنگی پر مدہوشی کا غلاف چڑھ گیا۔

کچھ دیر تک مبہوت اور بے حس و حرکت رہنے کے بعد نوجوان کے ہونٹوں پر جنبش ہوئی۔ خماری لہجے میں ہولے سے ایک سوال ابھرا۔

''تم کون ہو اے روحِ حیات؟''

''میں جان فزا ہوں اے مسافرِ برگشتۂ جہات و کائنات!'' دلبری سے لبریز لبِ لعلیں سے نغمہ ریز جواب پھوٹا۔''

''تم سچ مچ جاں فزا ہو جاں فزا!'' زبان کے ہمراہ نوجوان کی آنکھیں بھی بولنے لگیں۔

''واقعی؟'' جاں فزا کی نظریں بھی سوال کرنے لگیں۔

''بلاشبہ۔'' نوجوان کی زبان اور آنکھوں دونوں نے یقین دلایا۔

''شکریہ۔''

''کس بات کا؟''

''قدر دانی کا''۔

''ایک سوال اور پوچھوں؟''

''پوچھو۔''

''اس بیاباں میں تم کیسے؟''

''سچ بتاؤں۔''

''ہاں، سچ بتاؤ۔''

''تمھیں یقین نہیں آئے گا۔''

''پھر بھی بتاؤ۔''

''میں تمھارے لیے آئی ہوں۔''

''کیا؟''

''ہاں۔''

''کیوں اس صحرا گزیدہ ستم رسیدہ سے مذاق کر رہی ہو؟''

''یہ مذاق نہیں، حقیقت ہے جاں نثار! میں سچ مچ تمھارے لیے آئی ہوں۔''

''تم میرا نام بھی جانتی ہو!'' جاں نثار کے دیدے پھیل گئے۔

''میں تمھارے بارے میں اور بھی بہت کچھ جانتی ہوں۔''

''کیا؟ سچ بتاؤ تم کون ہو، میں نے تمھیں خواب میں بھی نہیں دیکھا ہے اور تم میرے بارے میں ------ ''اس کے دیدوں کا پھیلاؤ اور بڑھ گیا۔

''میں جاں فزا ہوں، پری خانے کی ایک پری۔ میرا کام تم جیسے انسانوں کو صعوبتوں سے نجات دلانا اور تمھارے اضطراب کو سکون پہنچانا ہے۔''

''اچھا!'' جاں نثار کی حیرت بڑھتی گئی۔

''تمھیں یقین نہیں ہو رہا ہے نا؟''

''ہاں، یقین تو نہیں ہو رہا مگر تم سے میرے اضطراب کو سکون ضرور مل رہا ہے۔

''آہستہ آہستہ یقین بھی ہو جائے گا۔''

''خدا کرے ایسا ہو! ایک اور بات پوچھوں جاں فزا؟''

''ضرور پوچھو۔''

''تم پرستان کے پرسکون ماحول کی رہنے والی ایک نازک اندام مخلوق ہو۔ ہم جیسے انسانوں کے لیے اس گرم صحرائی فضا میں کیوں آئی ہو؟''

''تا کہ تمھارا اضطراب کم کر سکوں۔ تمھیں سکون پہنچا سکوں اور یہ بات میں تمھیں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔''

''مگر کیوں؟ اس میں تمھارا کیا فائدہ ہے۔؟''

''یہ تو میں بھی نہیں جانتی۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ میرے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ میں مشتعل اور مضطرب مسافروں کی مدد کروں۔ ان کا اضطراب مٹاؤں۔ انھیں پرسکون بناؤں مگر تمھارے تئیں اس فرض میں میرا دل بھی شامل ہو گیا ہے۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تم پر میرا دل آ گیا ہے۔ کیا اس محاورے کا مفہوم بھی سمجھانا پڑے گا؟''

''نہیں، یہ میں سمجھتا ہوں۔''

''پھر تو تم یہ بھی سمجھتے ہو گے کہ دلِ عاشق اپنے محبوب کے دل کے ساتھ تنہائی میں ملنا چاہتا ہے۔ اس سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔''

''ہوں۔''

''تو چلیں پرستان کے کسی خلوت خانے میں۔''

''انکار کی جرأت میں اپنے اندر نہیں پا رہا ہوں۔''

جاں فزا آگے بڑھی اور جاں نثار کو اپنے ہمراہ لے اڑی۔ پلک جھپکتے ہی وہ پرستان کے ایک خلوت کدے میں پہنچ گئے۔

جاں فزا نے جاں نثار کے جسم سے لباسِ بیابانی اتروا کر اسے پرستانی پوشاک سے آراستہ کر دیا۔

لباس کے تبدیل ہوتے ہی جاں نثار بھی بدل گیا۔ بے تاب جسم پر سکون کا لبادہ چڑھ گیا۔ بے قرار جان کو قرار آ گیا۔ ویران آنکھوں میں نور بھر گیا۔ مضمحل اور پژمردہ چہرہ شگفتہ دکھائی دینے لگا۔

جاں فزا کی نگاہیں جاں نثار کے سراپے پر مرکوز ہو گئیں۔

''اس طرح کیا دیکھ رہی ہو جاں فزا؟''

''یہی کہ تم کتنے وجیہہ، کتنے پروقار اور کتنے پرکشش ہو! تمھارے مردانہ حسن میں ایسی جاذبیت ہے کہ آنکھوں کو اپنے پاس ٹھہرا لے۔ دیکھنے والے کا چین چھین لے۔ مخاطب کا ہوش اڑا دے۔ اسے پاگل بنا دے۔''

''تم پھر مراق اڑانے لگیں جاں فزا!''

''نہیں، جاں نثار! یہ مذاق نہیں ہے۔ میں حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ تمھیں یقین نہیں آ رہا ہے تو آؤ میرے ساتھ۔''

''کہاں؟''

''آؤ تو۔''

جاں فزا جاں نثار کا ہاتھ پکڑے تیزی سے دوسرے کمرے میں داخل ہو گئی۔

اس کمرے کے آئینے نے جاں نثار کو حیرت میں ڈال دیا۔ وہ اتنا پرکشش ہے، کبھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ جاں فزا کی ذرا سی توجہ اور ظاہری آرائش نے اسے اتنا خوبصورت بنا دیا تھا کہ خود اسے اپنا سراپا، اس کا اپنا نہیں لگ رہا تھا۔ اگر اس پر پوری توجہ ہو جائے اور وہ چیز اسے مل جائے جس کے لیے وہ صحرا میں بھٹکتا پھر رہا ہے تو اس میں اور کتنی شادابی پیدا ہو سکتی ہے وہ اور کتنا دل کش ہو سکتا ہے! اس کا ذہن اپنی ذات کے تصور میں کھو گیا۔

''کیا میں مذاق کر رہی تھی؟''

جاں نثار خاموش رہا۔

''بولو جاں نثار! کیا یہ آئینہ بھی مذاق کر رہا ہے؟ تمھاری خاموشی میری تائید کر رہی ہے جاں نثار! تم سچ مچ بہت خوبصورت ہو۔ تمھارے مردانہ حسن نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔ مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے عشق!''

''مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے''۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ خوبصورتی ریگستان میں نہیں، پرستان میں ہوتی ہے۔ کشش خزاں رسیدوں میں نہیں، باغ و بہار کے پروردوں میں ہوتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے جاں فزا کہ دیوانہ مجھے تم نے بنا دیا ہے۔ میں تمھارے پاس آ کر سب کچھ بھول گیا ہوں۔ مجھے اب کچھ بھی یاد نہیں رہا، یہاں تک کہ...''

''تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''بالکل سچ۔''

''گویا ہم دونوں ایک ہی جذبے سے مغلوب ہیں۔'' جاں فزا جاں نثار کے قریب آ گئی۔ ہوش ربا خوشبوؤں کا جھونکا جاں نثار کی سانسوں کے دریچے میں اتر گیا۔

جاں فزا نے اپنی پرفسوں آنکھیں جاں نثار کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ آفتابی دیدوں سے نکلی نشیلی روشنی کی تیز شعاعیں جاں نثار کو بے قابو کرنے لگیں۔ وفورِ شوق میں اس کی گردن جاں فزا کے چہرے کی طرف جھک آئی مگر جھجھک اب بھی باقی رہی۔ رمز شناس پرستانی دوشیزہ نے آگے بڑھ کر اپنے لب جاں نثار کے ہونٹوں سے ملا دیے۔

جاں نثار نے اپنے اندر شہد کا سا مٹھاس محسوس کیا۔ جاں فزا کی شفاف مخروطی انگلیاں جاں نثار کے جسم پر رقص کرنے لگیں۔ انگلیوں کی تھرکن نے جاں نثار کے رگ و پے میں ارتعاش پیدا کر دیا۔

جاں نثار کے ہونٹ جاں فزا کے لبوں کو چومنے اور چوسنے کے بعد اس کی آبِ

رواں جیسی شفاف رانوں پر اتر آئے اور باری باری سے دونوں رانوں پر کچھ دیر تک زبان پھیرنے کے بعد وہاں سے اٹھ کر جاں فزا کے کھلے ہوئے پستانوں کی سمت لپک پڑے۔ دونوں گولائیوں پر کچھ دیر تک زبان پھیرنے کے بعد جاں نثار کے ہونٹوں نے ایک پستان کے نکیلے حصّے کو اپنے اندر لے لیا اور وہ گرسنہ لب اسے اس طرح چوسنے لگے جیسے کوئی شیر خوار بچہ اپنی ماں کی چھاتی کو چوستا ہے۔ ایک پستان کے بعد جاں نثار نے دوسرے پستان کو اپنے منہ میں لے لیا۔

دوسرا پستان چوستے چوستے اچانک اس کے متحرک ہونٹ ساکت ہو گئے۔ پستان ہونٹوں سے باہر نکل آیا۔ منہ کا اندرونی حصّہ خشک ہو گیا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ ہونٹوں کے ساتھ ساتھ جاں نثار کا جسم بھی بے دم سا ہو گیا۔

''تم کہاں ہو جاں نثار؟'' جاں فزا یکبارگی چونک پڑی۔

''میں یہیں ہوں جاں فزا۔ تمھارے پاس۔'' دبی زبان میں جواب برآمد ہوا۔

''نہیں، جاں نثار! تم یہاں نہیں ہو۔ تم کہیں اور ہو۔ سچ بتاؤ، تمھارا ذہن اس وقت کہاں ہے؟''

''جاں فزا! میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ دراصل اس وقت میں پیاس کی زد میں ہوں۔''

''صاف صاف بتاؤ جاں نثار! اس وقت تم کہاں کھوئے ہوئے ہو۔''

''پانی کی تلاش میں۔''

''پانی کی تلاش میں؟'' پانی کیا میرے ان پیارے پیارے رسیلے پستانوں سے زیادہ اہم ہے؟''

''ہاں، جاں فزا! پانی زیادہ اہم ہے۔ بلاشبہ تمھارے یہ پستان بہت پیارے ہیں۔ ان میں شاید رس بھی ہے اور ان میں میرے لیے پیار بھی مگر -----

''مگر کیا؟''

''مگر یہ کہ ان میں پانی نہیں ہے۔''

''حیرت ہے کہ ان کی موجودگی میں تم پانی -----

''تمھاری حیرت بجا ہے۔ اس لیے کہ تم پری زاد ہو۔ تمھیں پیاس نہیں لگتی۔ تم پیاس اور پانی کے رشتے کو نہیں سمجھ سکتیں۔ مجھے جانے دو جاں فزا! میری بھڑکی ہوئی پیاس مجھے اب اور یہاں نہیں رہنے دے گی۔ مجھے پانی کی تلاش میں نکلنا پڑے گا۔ اس لیے میں اب چلتا ہوں۔''

''ٹھہرو! تمھیں پانی چاہیے نا۔ میں ابھی آتی ہوں اور آبیاژوں کا ڈھیر تمھارے سامنے لگا دیتی ہوں۔ جی بھر کر اپنی پیاس -----

''آبیاژہ! تم کیسے جانتی ہو آبیاژے کو؟ آبیاژہ تو دارالامان میں -----

''جاں نثار! آبیاژہ ہماری بھی ملکیت ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''جاں نثار! میں دارالامان کے پری خانے کی پری ہوں۔''

''اچھا تو تم دارالامان کی پری ہو!'' جاں نثار کی آنکھوں میں ایک بار پھر سے حیرت بھر گئی۔

''جاں نثار! میں ابھی آئی۔'' جاں فزا تیزی سے محل کے دوسرے کمرے کی طرف روانہ ہوگئی۔

جاں نثار کا ذہن دارالامان کے اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں اس کی پیاس بجھانے کے لیے طرح طرح کی سبیلیں نکالی گئی تھیں۔

''لو، اسے چوسو! تمھاری پیاس بجھ جائے گی۔'' ڈبّے سے ایک آبیاژہ نکال کر جاں فزا جاں نثار کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔''

''جاں نثار کی نگاہیں جاں فزا کی انگلیوں میں دبی ایک سفید چوکور ٹکیے کی جانب مرکوز ہوگئیں۔ صاف شفاف ٹکیے سے رنگ و نور کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔''

اس شفاف چوکور ٹکیے میں ایک ایک کر کے وہ سارے منظر ابھر آئے جو دارالامان کے ایک پراسرار کمرے میں محدّب شیشے پر اس کی اکتاہٹ دور کرنے کے لیے ابھارے گئے تھے۔

پہلے منظر میں ایک مطربہ ابھری۔ اس کے اردگرد سازندے ابھرے۔ سازندوں کے آگے طرح طرح کے ساز ابھرے۔ سازوں کے تار چھڑے اور تاروں سے جھنکاریں ابھریں۔ جھنکاروں کے ساتھ ہی مطربہ کے لب کھلے اور ان لبوں سے صوت وصدا کے آبشار پھوٹتے چلے گئے۔

دوسرے منظر میں ایک رقاصہ نمودار ہوئی۔ گھونگھرو چھنکے۔ کولھے مٹکے، ٹھمکے برسے۔ کمر لچکی۔ لوچ کے تیر چلے۔ دیدے چمکے۔ پتلیاں ناچیں۔ آنکھوں سے آندھیاں اٹھیں۔ کرشمے نکلے۔ غمزے برسے۔ بھنوؤں کی کمانی تنیں۔ بھاؤں کے بھید کھلے۔ اداؤں کے بان چھوٹے۔

تیسرے منظر میں جادو دکھا۔ کوزے میں دریا سمٹا۔ بوتل میں جن اترا۔ مٹھی سے کبوتر نکلا۔ خالی ڈبا مٹھائی سے بھرا۔ آگ میں پھول کھلا۔ آب میں شعلہ اگا۔ مرد عورت بنا۔ آدمی خلا میں معلق ہوا۔

چوتھے میں کھیلوں کا رنگ جما۔ بازیوں کا زور چلا۔ بلّے چلے۔ گیندیں اچھلیں۔ تلواریں چلیں۔ تیر چھوٹے، قلابازیاں ہوئیں۔ دوڑ لگی، گھوڑے دوڑے۔ ہاتھی دوڑے۔ مرد دوڑے۔ عورتیں دوڑیں۔ زور آزمائی ہوئی۔ پہلوان لڑے۔ جسم بھڑے۔ پانی میں پیراکیاں ہوئیں۔ ڈبکیاں لگیں۔ لڑکیاں مچھلیاں بنیں۔ گورے چٹے، دبلے پتلے، چھریرے چھریرے جسم تیرے۔ کھلے کھلے اعضا چمکے۔

پانچویں منظر میں سائنس کے کمالات و ایجادات کا مظاہرہ ہوا۔ میزائلیں چھوٹیں۔ خلا میں تیارے اڑے۔ چاند ستاروں اور سیاروں کا سیر ہوا۔ قطبیں ملیں۔ فاصلے مٹے۔ زمین آسمان ایک ہوئے۔

چھٹے منظر میں ادب کو منظر میں لایا گیا۔ کہانیاں کہی گئیں۔ تجسس بڑھایا گیا۔ تخیل کو اڑایا گیا۔ جذبۂ شوق کو جگایا گیا۔ شدتِ احساس کو بڑھایا گیا۔ لطف و انبساط کا دریا بہایا گیا۔

آبیاژے سے اٹھ کر جاں نثار کی نظریں جاں فزا کے پستانوں پر پہنچ گئیں۔ گورے گدرائے سڈول پستانوں سے رنگ ونور کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔

کچھ دیر تک پستانوں کے رنگ ونور کو دیکھنے کے بعد نگاہیں اوپر اٹھ کر جاں فزا کے لبوں کی جانب مبذول ہوگئیں۔

رس سے بھرے سرخ لبوں کے معائینے کے بعد نگاہیں وہاں سے اتر کر رانوں پر آگئیں اور صاف شفاف رانوں کا جائزہ لے کر پھر سے جاں فزا کی انگلیوں میں دبے آبیاژے پر مرکوز ہوگئیں۔

اچانک اس کے کانوں میں گہرائی سے آتے ہوئے وہی قہقہے سنائی دیے جو کبھی کنویں کے پاس سنائی پڑے تھے۔

جاں نثار کی پیشانی پھر سکڑ گئی۔ اس کی بھنویں تن گئیں۔ دیدے سُلگ اٹھے۔ آنکھوں میں چنگاریاں بھر گئیں۔ جبڑے سخت ہوگئے۔ مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ہاتھ ہوا میں لہرانے لگے۔

وہ جاں فزا کے پاس سے اٹھ کر باہر جانے لگا۔

''کہاں جارہے ہو جاں نثار! رک جاؤ۔ اچھا! یہ آبیاژہ تو لے لو جاں نثار! دیکھو اس سے تمھاری پیاس ضرور بجھ جائے گی...'' جاں فزا اسے آواز دیتی رہی مگر اس کے پاؤں نہیں رکے۔ وہ غیض وغضب میں آگے بڑھتا گیا۔

محل سے باہر نکل کر اس کا اشتعال اور اضطراب اور بڑھ گیا۔''

اس کے کانوں میں گونجنے والے قہقہوں کی آوازیں یکبارگی خاموش ہوگئیں۔ جیسے ان پر فالج گر پڑا ہو۔ یا کسی نے قہقہہ لگانے والے کی گردن دبادی ہو۔

کچھ دور جانے کے بعد جاں نثار کے پاؤں پھر رک گئے۔اس کے مشتعل ہاتھ پھر ٹھٹھک گئے۔

ایک نئی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھی:

آ اے دھوپ میں جھلسنے والے نوجوان اجنبی
ترے جسم سے تمازت کے خار نکال دوں
تجھ پر اپنی زلفیں پسار دوں
تری زندگی کو سنوار دوں
تجھے پیار دوں
آ اے دشت وصحرا میں بھٹکنے والے پریشان اجنبی
تری بے کلی کو سنبھال دوں
ترے دل کو صبر وقرار دوں
ترا رنگ وروپ نکھار دوں
تری زندگی کو سنوار دوں
تجھے پیار دوں

اس کی نگاہیں آواز کے تعاقب میں بھٹکنے لگیں۔

درد کی کمی کا کرب

صبح کی سیر کے دوران راستے میں روزانہ ہی اظہار الدین کی نگاہیں ایک پرکشش معمر خاتون پر پڑتیں۔ اس خاتون کے ایک ہاتھ میں ایک پٹا ہوتا ہے اور اس پٹے سے بندھا ایک کتا۔

کتے کے کسے ہوئے سڈول اور چھریرے جسم پر ایک گرم کپڑے کی صدری چڑھی ہوتی جس کا رنگ ہر دوسرے تیسرے دن بدل جاتا۔ کتا سر سے پا تک صاف ستھرا چکنا اور پرکشش دکھتا تھا۔ وہ اس معمر خاتون کے ہمراہ اس طرح چلا کرتا جیسے کسی زمانے میں لکھنؤ کے شرفا چلا کرتے تھے۔

معمر خاتون کے دوسرے ہاتھ کی مٹھی کسی کسی موڑ پر کھل جاتی اور ان کی ہتھیلی سے رنگ برنگ کے خشک میوے جھانکنے لگتے۔ مٹھی کھولتے وقت ان کے منہ سے ایک مخصوص قسم کی آواز نکلتی۔ آواز پر کتے کی گردن ہتھیلی کی طرف مڑ جاتی اور اس کا منہ آہستہ آہستہ چلنے لگتا۔

کتے کے ڈیل ڈول، اس کی چکنی چمک دار کھال، اس کے صاف ستھرے سڈول جسم، پیٹھ پر پڑی گرم رنگین صدری اور میوے سے بھرا اس کا منہ دیکھ کر بار بار اظہار الدین کی نظریں سڑک کے کناروں پر دوڑ جاتیں جہاں کچی اور کنکریلی زمین پر دبلے پتلے، مریل جسم، دھنسے ہوئے پیٹ، باہر نکلی ہوئی ہڈیوں، ڈھیڈ کیچ سے سنی آنکھوں، ناک سے لبوں تک بہتی پیلی رطوبت، گالوں پر جگہ جگہ چپکی ریٹ، گردن، ہتھیلیوں، ہاتھ پیروں اور دوسرے

انگوں پر جمے میل کے چکتے والے بچے، میلے کچیلے، پھٹے پرانے ہلکے کپڑوں میں اپنے دونوں ہاتھوں سے سینے کو دبائے ٹھٹھر رہے ہوتے جیسے اپنے اندر گرمی بھر رہے ہوں یا اندر کی حرارت کو باہر نکلنے سے روک رہے ہوں۔ اس وقت اظہارالدین کے جی میں آتا کہ کتے کی پیٹھ سے صدری کھینچ کر کسی بچے کو پہنا دیں اور معمر خاتون کی مٹھی سے میوے چھین کر فٹ پاتھ پر پڑے بچوں کی طرف اچھال دیں۔ ان کے جی میں یہ بھی آتا کہ وہ اس معمر خاتون سے کہیں کہ وہ فٹ پاتھ پر ٹھٹھرتے ہوئے بچوں میں سے کسی کو کیوں نہیں پال لیتیں۔ دونوں کی عاقبت سنور جائے گی۔ اظہارالدین کے دل میں اٹھی یہ بات ان کے لبوں تک تو نہ آسکی مگر دب بھی نہ سکی۔

ایک دن اس خاتون کو ایک بڑے سے گیٹ والے مکان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر اظہارالدین کے پاؤں ٹھٹھک گئے۔ اس گیٹ کے دہنی طرف کھمبے پر ایک تختی لگی تھی جس پر اردو میں ''خواب زار'' لکھا تھا۔ اردو رسم الخط میں لکھا ہوا اردو لفظ اس بڑے مکان بلکہ حویلی کہنا چاہیے، کے لمبے چوڑے گیٹ پر اظہارالدین کو بہت اچھا لگا۔ اس اردو لفظ کی بدولت اس مکان اور مکان کی مکین سے انہیں آناً فاناً میں اُنس سا ہو گیا۔

دوسرے دن اس خاتون پر نظر پڑتے ہی ان کے احترام میں اظہارالدین کا ہاتھ اٹھ گیا اور ساتھ ہی لبوں سے ایک لفظ ''آداب'' بھی اچھل پڑا۔

معمر خاتون نے اظہارالدین کی طرف چند ثانیے کے لیے غور سے دیکھا اور جواب میں بہت ہی بے دلی سے ''آداب'' پھینک کر آگے بڑھ گئیں۔

دوسرے دن اظہارالدین کے ''آداب'' میں ''کیسی ہیں؟'' کا فقرہ بھی جڑ گیا۔ جواب میں اُدھر سے فائن، تھینک یو! تو نکلا مگر ان لفظوں میں وہ بات اظہارالدین کو محسوس نہیں ہوئی جس کی وہ توقع کر رہے تھے۔

اظہارالدین کے روز روز مزاج پوچھنے پر ایک دن معمر خاتون کے منہ سے بھی ایک جملہ نکل آیا ''آپ کیسے ہیں؟''

اظہارالدین کو ان کے منہ سے یہ جملہ سن کر بہت اچھا لگا۔ پھر باقاعدہ دونوں طرف سے کیسی ہیں اور کیسے ہیں؟ کا سلسلہ چلنے لگا۔ ان جملوں نے انہیں کچھ قریب لا دیا۔

''کل آپ نہیں آئیں؟'' اظہارالدین نے ایک دن ان سے پوچھا تو بولیں۔

''جی، گلفام بیمار تھا۔''

''گلفام! اظہارالدین چونکے۔

''میرا ڈوگ۔''

''او--- کیا ہوا تھا اسے؟''

''یہی سیزنل ڈیزیز، نزلہ زکام۔''

''اب کیسا ہے؟''

''بہتر ہے۔''

''آج اسے ٹہلانے نہیں لائیں؟''

''آج وہ ریسٹ کر رہا ہے۔''

''گلفام بہت پیارا ہے۔''

''تھینک یو۔''

''خدا کرے وہ پوری طرح جلد سے جلد ٹھیک ہو جائے۔''

اس جملے کی ادائیگی کے وقت پتا نہیں اظہارالدین کو کیوں ایسا محسوس ہوا جیسے انہوں نے یہ کہا ہو کہ خدا کرے وہ جلد سے جلد مر جائے۔''

''تھینک یو، ویری مچ، چلتی ہوں، گلفام کو اسٹیم (Steam) دلوانا ہے۔'' وہ تیز تیز ڈگ بھرتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

اظہارالدین کی آنکھیں انھیں دور تک دیکھتی رہیں۔ ان کے اوجھل ہوتے ہی اظہارالدین کے دیدوں کے سامنے ایک منظر ابھر آیا۔

'' بیٹے! آج چھٹی لے لو۔ تمہارے ابّو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ان کے سینے

میں رہ رہ کر درد اٹھ رہا ہے، خدانخواستہ درد زیادہ بڑھ گیا تو۔۔۔۔"

"امّی! آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ گیس کی پرابلم ہے۔ دوا دے دی گئی ہے۔ کچھ دیر میں اپنے آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور آپ تو ہیں ہی۔ میں رکا تو میرا بہت بڑا نقصان ہو جائیگا۔"

یہ منظر اظہار الدین کی آنکھوں کو گیلا کر گیا۔

معمر خاتون سے اظہار الدین کی بے تکلفی بڑھتی گئی۔ ایک دن وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے کہ ایک موڑ پر اظہار الدین کے منہ سے اچانک ایک جملہ نکل گیا۔ کیا آپ کی نظریں کبھی ان پر نہیں پڑتیں؟"

اظہار الدین کا اشارہ سمجھ کر وہ بولیں۔

"اب نہیں پڑتیں۔"

"مطلب؟"

"مطلب وہی جو میں نے بتایا۔"

"اب" سے تو مطلب یہی نکلتا ہے کہ پہلے پڑتی تھیں۔"

"آپ نے صحیح مطلب نکالا۔"

"لیکن میری سمجھ میں پوری بات نہ آسکی۔ براہِ کرم وضاحت کرنے کی زحمت گوارا کریں۔" اظہار الدین نے وضاحت چاہی۔

"آج نہیں، آج سنڈے ہے۔ جلدی گھر پہنچنا ہے۔ فزیوتھر پسٹ اور بیوٹیشن گلفام کا ویٹ کر رہے ہوں گے۔"

"گلفام کا ویٹ! خیریت تو ہے؟" اظہار الدین نے تشویش کا اظہار کیا۔

"دراصل آج گلفام کے مساج کا دن ہے۔ آج اسے اکسرسائز کرایا جاتا ہے۔ اسے اسپیشل باتھ بھی کرایا جاتا ہے۔ اسے سجایا سنوارا جاتا ہے۔ آج وہ میرے ساتھ فن مارکیٹ جاتا ہے۔ فن مارکیٹ میں بہت ساری سجی سنوری بچیز Bitches آتی ہیں۔ وہ

گلفام کی طرف دیکھتی ہیں۔ گلفام انہیں اچھا لگتا ہے۔ ان کا اس کی طرف دیکھنا اسے بھی اچھا لگتا ہے۔ اور یہ سب کچھ مجھے بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ اس لیے آج نہیں، کسی اور دن۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ بائی!''

وہ گلفام کا پتا سنبھالے جلدی جلدی اپنے گھر کی طرف چل پڑیں۔ اظہارالدین کافی دیر تک گلفام کی جانب دیکھتے رہے۔ وہ اور چست درست اور چکنا اور سڈول ہوتا گیا۔ گلفام کے تعاقب کے دوران بہت سارے مناظر اظہارالدین کی آنکھوں میں ابھرتے گئے۔ ان میں ایک جانا پہچانا چہرہ بھی تھا۔ اس چہرے میں آنکھوں کے اردگرد سیاہ ہالے بن گئے تھے۔ رخساروں پر جھرّیاں پڑ گئی تھیں۔ دونوں آنکھوں کے نچلے حصّے سوجے ہوئے تھے جیسے ان میں تتیا نے اپنے ڈنک گڑو دیے ہوں۔ ہونٹوں کے دونوں جانب ناک کے پاس سے ہوتی ہوئی دو لکیریں ٹھوڑی تک گہری ہوتی چلی گئی تھیں۔

اس چہرے کے ابھرتے وقت اظہارالدین کے کانوں میں کچھ جملے بھی گونج پڑے تھے۔

''جناب اب وقت آ گیا ہے کہ مہینے میں ایک آدھ بار Facial کرالیا کریں ورنہ جھرّیاں گہری ہوتی جائیں گی اور گوشت لٹکتا چلا جائے گا اور۔۔۔۔۔''

جب جب یہ جملے اظہارالدین کے کانوں میں گونجے تھے اور آنکھوں نے چہرے کو دیکھا تھا، دل نے دماغ کو اکسایا تھا کہ مسلسل ڈھیلا ہونے والے چہرے کو کسنے کا جتن کیا جائے مگر دماغ نے دل کے سامنے اس چہرے کو لا کر کھڑا کر دیا تھا جو اس شخص کے بیٹے کے خوابوں میں پل رہا تھا اور جس کو پروان چڑھانے کے لیے اسے بہت سارے جتن کرنے تھے۔

معمر خاتون کا جملہ کئی دنوں تک اظہارالدین کو پریشان کرتا رہا۔ ان کے تجسس کو بڑھاتا رہا۔ وہ ان سے ملتی رہیں مگر اظہارالدین ان سے ان کے اجمالی جواب کی تفصیل نہ جان سکے کہ وہ جب بھی ملیں، کوئی نہ کوئی ان کے ساتھ چلتا رہا یا وہ عجلت میں رہیں۔

ایک دن اتفاق سے وہ اکیلی نظر آئیں اور ان کی رفتا میں ٹھہراؤ بھی دکھائی دیا تو لپک کر اظہارالدین ان کے ساتھ ہو گئے۔ علیک سلیک کے بعد بغیر کسی تمہید کے وہ شروع ہو گئے۔

''کیا میں اس دن کی ادھوری بات کو پورا کرنے کے لیے درخواست کر سکتا ہوں؟''

''کون سے ادھوری بات؟'' وہ چونکیں۔

''یہی کہ ان فٹ پاتھوں پر پہلے آپ کی نظریں پڑتی تھیں مگر ان--------''

''اچھا! یہ۔ ہاں، یاد آیا۔ بات یہ ہے مسٹر اظہار کہ فٹ پاتھوں پر پڑے ان لوگوں کے حالات مجھے بھی کبھی بہت بے چین کرتے تھے اور میں ان کے حالات کو بدلنے کی فکر بھی کیا کرتی تھی۔ ایک آدھ بار اس کے لیے میں نے ذاتی طور پر عملی اقدامات بھی کیے۔ مثلاً ایک کنبے کو پالا۔ سڑک سے اٹھا کر انہیں اپنے بنگلے میں لائے۔ اپنے آؤٹ ہاؤس میں انہیں رہنے کی جگہ دی۔ ان کے لیے کپڑے بنوائے۔ ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ کافی دنوں تک ہم ان کو اپنے پیسوں سے پالتے رہے مگر ایک دن میں نے دیکھا کہ اس کنبے کی عورت نے میری جگہ لینے کی کوشش شروع کر دی تھی اور اس کوشش میں مسلسل آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں جب بہت لمبے ہو گئے تو مجھے مجبوراً انہیں اپنے گھر سے نکالنا پڑا۔

ایک مرتبہ ایک بچے کو بھی پالا۔ اسے فٹ پاتھ سے اٹھا کر اپنے گھر میں رکھا۔ اسے اچھا کھلایا۔ اچھا پلایا۔ اچھا پہنایا۔ اچھی طرح رکھا بالکل اپنی اولاد کے موافق۔ اسے پڑھایا، لکھایا، بڑا کیا۔ اس کے لیے بہت کچھ سوچا بھی تھا۔ کچھ منصوبے بھی بنائے تھے مگر ایک دن جب میں گھر سے کہیں باہر گئی ہوئی تھی تو وہ میرے شوہر کا گلا گھونٹ کر چلا گیا۔

معمر خاتون کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ لہجہ ڈبڈبا گیا۔ انہوں نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کیں اور اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولیں۔

''دوسری طرف گلفام اور اس کی ماں ہیں۔ گلفام کی ماں ہمارے پاس بہت دنوں

تک رہی۔ ہمارے پاس ہی پیدا ہوئی اور پاس ہی مری۔ مگر جب تک زندہ رہی کبھی کسی دوسرے کتے سے نہیں لگی۔ وہ اسی وقت لگی جب ہم نے کتے کا انتظام کیا۔

اچانک کسی گھر کی چہار دیواری سے کوڑے کا ایک تھیلا راستے پر آ کر گرا اور اس کے اندر کی چیزیں سڑک پر بکھر گئیں۔ ان میں ہڈی کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔ اسے دیکھتے ہی فٹ پاتھ کے بچوں کی للچائی نظریں بکھرے ہوئے کوڑے کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ بعض بچے کوڑے کے اس تھیلے کی جانب دوڑ پڑے اور ان میں چھینا جھپٹی بھی شروع ہو گئی۔ مگر گلفام خاموشی سے چلتا رہا۔ اس ہڈی کی طرف ٹھیک سے اس نے دیکھا بھی نہیں۔

''اور یہ گلفام بالکل اپنی ماں پر گیا ہے۔ اسی کی طرح وفادار، فرض شناس۔ اپنے مال پر جان چھڑکنے والا۔ ایک بار یہ مجھے بچانے کی خاطر ایک بہت ہی خطرناک دشمن سے بھڑ گیا۔ اور اس وقت تک لڑتا رہا جب تک کہ اسے کاٹ کر بھگا نہیں دیا۔ شاید اسی گلفام کی وجہ سے آج میں زندہ ہوں ورنہ۔۔۔۔۔۔ میں سمجھتی ہوں آپ کے سوال کا جواب آپ کو مل گیا ہوگا۔ اب میں چلوں۔''

''وہ گلفام کے ساتھ آگے بڑھ گئیں۔''

اظہار الدین کی نظریں فٹ پاتھ کی جانب مرکوز ہو گئیں۔

انھیں وہاں کوئی بھی عورت نظر نہ آ سکی جس نے معمر خاتون سے ان کے شوہر کو چھیننے کی کوشش کی ہو۔ وہاں کوئی بھی ایسا بچہ دکھائی نہیں دیا جس نے معمر خاتون کے شوہر کا گلا ریت آیا ہو مگر اس کے باوجود اس وقت ان میں اظہار الدین کو وہ کشش محسوس نہ ہو سکی جو کچھ دیر پہلے تک محسوس ہوتی رہی تھی۔ ایک عجیب طرح کا دباؤ ان کے اندر در آیا تھا جو ان کے اس درد کو کم کرتا جا رہا تھا جس نے اس معمر خاتون سے بے تکلف ہونے پر انھیں مجبور کیا تھا۔

اس درد کی کمی نے اظہار الدین کو پریشان کر دیا۔ اس رات کافی دیر تک انھیں نیند نہ آ سکی۔ درد کی کمی کا احساس دل کو کچوکے لگاتا رہا۔ اس احساس سے دل تلملاتا رہا۔ رگ و پے میں اضطراب گھلتا رہا۔

دماغ نے دل کو جب اس طرح سمجھایا:

معمر خاتون نے جو واقعات سنائے ممکن ہے وہ محض فسانے ہوں۔ حقیقت سے ان کا تعلق ہو ہی نہیں۔ انھوں نے اس لیے سنائے ہوں تا کہ فٹ پاتھ کے قابل رحم باشندوں کی طرف نہ دیکھنے کا جواز پیدا ہو سکے۔ اور ان پر بے حسی یا بے رحمی کا الزام نہ عائد ہو سکے۔

اور مان لیں کہ وہ واقعات سچے بھی ہوں تب بھی قصوروار صرف وہ عورت اور وہ بچہ کہاں ٹھہرتے ہیں؟ ہوسکتا ہے قصور سراسر معمر خاتون کے شوہر کا ہو۔ اس نے ہی اس عورت کو اپنی طرف آنے کا لالچ دیا ہو۔ کھانا، وہ بھی اچھا کھانا اگر بھوکے کو دعوت دے تو بھوکا بے چارہ بھلا اپنے کو کب تک اور کیسے روک سکتا ہے؟

اسی طرح معمر خاتون کے شوہر کے قتل میں بھی ممکن ہے خود قتل ہونے والے کا ہاتھ ہو۔ وہ بچہ جسے انھوں نے فٹ پاتھ سے اٹھا کر اپنے گھر میں پالا تھا اور بقول معمر خاتون کے اسے اپنا پن اور پیار دیا تھا، ممکن ہے وہ انھیں اپنا باپ تصور کرنے لگا ہو اور ایک باپ سے بیٹے کی جو توقعات ہوتی ہیں اس نے ان سے لگا رکھی ہوں اور ان کی تکمیل کے لیے اس نے باپ سے خواہش کی ہو اور خواہش کے اظہار میں ممکن ہے ضد بھی کی ہو مگر باپ اسے ایک ایسے فرد سے زیادہ نہ گردانتا ہو جس پر اس نے احسان کر رکھا ہو اور اس بچے کی توقعات کی خواہش کا گلا اس نے گھونٹ دیا ہو۔ اور ردّ عمل میں کوئی تکرار ہوئی ہو اور پھر تکرار نے سنگین صورت اختیار کر لی ہو۔

تو دماغ کی اس منطق نے لوری کا کام کیا اور اظہار الدین کو نیند آ گئی۔ دوسرے دن حسب معمول وہ سیر کو نکلے تو معمر خاتون اور ان کے کتے پر نظر پڑی۔ ان سے ہٹ کر فٹ پاتھ پر بھی نگاہیں مبذول ہوئیں مگر آج فٹ پاتھ پر پڑے مریل جسم کی پسلیاں ان کے اندر نہیں چبھیں۔ ان جسموں کے پیٹ کا گڈھا اظہار الدین کو اپنے اندر نہیں اتار سکا۔ چہروں کی زردی ان کی آنکھوں میں نہ سما سکی۔ بے لباس بدن کی کپکپاہٹ انھیں نہ لرزا سکی۔

معمر خاتون کے کتے کی صدری اتار کر کسی ننگے بچے کو پہنانے اور ان کی مٹھی سے میوے چھین کر فٹ پاتھ کی جانب اچھالنے کی خواہش بھی آج زور نہ مار سکی۔ دماغ کی رات والی منطق بھی کام نہ آسکی۔ اظہارالدین حیران و پریشان اپنے احساس کو کوستے ہوئے گھر واپس آ گئے۔ وہ کئی دنوں تک صبح کی سیر کو بھی نہ نکل سکے۔

وہ گھر میں گم سم رہنے لگے جیسے ان کو لقوہ مار گیا ہو۔ ان کی اس کیفیت نے ان کی بیوی کو بھی پریشان کر دیا۔ ایک دن بیوی ان کے قریب آ کر بولی:

''تم آج کل کھوئے کھوئے سے رہتے ہو! کوئی بات ہوگئی ہے کیا؟''

''تم بھی تو آج کافی اداس لگ رہی ہو، کسی نے پھر کچھ کہا کیا؟''

جواب دینے کے بجائے اظہارالدین نے سوال کر دیا۔

''تم نے آج کی خبر پڑھی؟'' جواب میں بیوی نے سوال کیا۔

''کون سی خبر؟'' اظہارالدین چونکے۔

''اچھا، تو تم نے نہیں پڑھی؟''

''بتاؤ تو سہی، کون سی خبر؟''

''یہی کہ ایک بیٹے نے اپنے باپ کا گلا کاٹ دیا''۔

''اچھا! مگر کیوں؟'' اظہارالدین کی حیرانی اور بڑھ گئی۔

''بیٹا چاہ رہا تھا کہ باپ اپنی ساری زمین جائداد بیٹے کے نام کر دے مگر باپ کا کہنا تھا کہ جلدی کیا ہے۔ ہمارے بعد سب کچھ تو اسی کا ہے پھر لکھا پڑھی کی کیا ضرورت ہے؟''

خبر سنا کر بیوی چپ ہوگئی۔

اظہارالدین کے لبوں پر بھی خاموشی طاری ہوگئی۔ دونوں دیر تک چپ سادھے بیٹھے رہے جیسے دونوں کے گلے میں کسی نے سرمہ ڈال دیا ہو۔

اس رات وہ دونوں سو نہیں پائے۔

رات بھر اظہار الدین کے اوپر اضطرابی کیفیت طاری رہی۔ صبح جب بہو نے ناشتہ لگایا اور پلیٹ کی ضرب سے آواز نکلی تو انھیں محسوس ہوا جیسے کسی نے پلیٹ ان کے سر پر دے مارا ہو۔

ناشتہ سے فارغ ہوکر وہ خاموشی سے مارکیٹ کی طرف نکل گئے اور ادھر ادھر گھومتے ہوئے جانوروں کی پینٹھ کی جانب جا پہنچے۔ بھیڑ بکریوں، بلّیوں، پرندوں کے جمگھٹوں کو دیکھتے ہوئے وہ اس کنارے تک پہنچ گئے جہاں سب سے زیادہ بھیڑ لگی تھی۔ وہاں چمچماتی ہوئی آہنی زنجیروں میں رنگ برنگ کے کتے بندھے تھے۔ ان کتوں کے کاروباری اپنے اپنے کتوں کی نسل کی خوبیاں گنوا رہے تھے:

''کوئی کہہ رہا تھا'' یہ السیشن ہے۔ بہادری میں اس کا جواب نہیں۔ دیکھیے اس کا قد وقامت۔ بالکل شیر لگتا ہے۔ دشمن دور ہی سے ڈر جاتا ہے۔''

''کوئی بتا رہا تھا۔'' یہ ڈوبرمین ہے بڑے قد کا چھوٹے بالوں والا ڈوگ بہت ہی خطرناک اور نہایت چست و چوکنا۔ اس کے ہوتے ہوئے مجال ہے کہ کوئی گھر میں گھس آئے۔

کوئی اپنے کتے کی تعریف کرتے ہوئے بول رہا تھا۔ یہ ہاؤنڈ ہے۔ یہ اس نسل کا کتا ہے جو بو سونگھ کر شکار کرتا ہے۔ دشمن اسے دیکھ کر یوں بھاگتے ہیں جیسے پولیس کو دیکھ کر چور۔

کوئی قصیدہ پڑھ رہا تھا۔ ''یہ بل ڈاگ ہے مضبوط جسم، بڑے سر اور نمایاں نچلے جبڑے والا کتا جو کبھی انگلستان میں بیل کے شکار کے لیے پالا جاتا تھا۔ آج اس سے ہر طرح کا شکار کیا جا سکتا ہے۔''

''کوئی اپنے کتے کا بکھان کرتے ہوئے پھولے نہیں سما رہا تھا کہ یہ دیسی نسل کا کتا ہے۔ نہایت ہی وفادار اور جاں نثار۔ اپنے مالک کی حفاظت کے لیے یہ اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کرتا۔''

اظہارالدین ایک ایک کتے کے متعلق ان کی خصوصیات سنتے اوران کے سراپے کو دیکھتے رہے۔ کافی دیر تک وہ اس بازار میں ٹہلتے رہے۔ ان کا یہ ٹہلنا صبح کی سیر سے مختلف تھا۔

آج کی رات بھی کرب و آلام میں کٹی۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات ابھرتے اورڈوبتے رہے۔ طرح طرح کے منظر بنتے بگڑتے رہے۔

دوسرے دن خلاف معمول صبح کی سیر کووقت سے ذرا پہلے ہی نکل گئے۔ دیر ے دیر ے ہوا خوری کرنے والوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ دوٗر سے معمر خاتون بھی نظر آگئیں۔ معمر خاتون جب قریب پہنچی تو ان کے پاؤں یک بارگی ٹھٹک گئے۔ ان کے ساتھ ان کا کتا بھی ٹھٹک گیا۔ دونوں کی نظریں اظہارالدین کے داہنے ہاتھ کی جانب مرکوز ہوگئیں۔

فٹ پاتھ کا ایک بچہ اظہارالدین کی انگلی پکڑے چل رہا تھا۔ آج اظہارالدین کا چہرہ ہر طرح کے کرب اور تناؤ سے خالی تھا۔

حکایتیں اور کہانی

اس نے کشکول اُٹھا تو لیا تھا مگر اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔
وہ کشکول لیے چوراہے پر کھڑا تھا۔
اسے کچھ حکایتیں یاد آ رہی تھیں:

''ایک بادشاہ کے پاس بے شمار دولت تھی مگر بادشاہ اس دوست میں سے ایک پائی بھی اپنے اوپر خرچ نہیں کرتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں لوٹا ہوا مال اور مانگا ہوا خراج شامل تھا۔ بادشاہ اپنے ہاتھوں سے ٹوپیاں بناتا تھا اور انھیں بازار میں بیچتا تھا۔ جو آمدنی ہوتی تھی اس سے وہ اپنی ضرورتیں پوری کرتا تھا۔''

''ایک بھوکے درویش کے آگے انواع واقسام کی نعمتیں لیے لوگ کھڑے رہے اور وہ فاقے کرتا رہا۔ ایک دن وہ درویش فاقے سے مر گیا مگر اس نے کسی کی بھیک قبول نہیں کی''

ہر حکایت پر انگلیوں کی کپکپاہٹ بڑھ جاتی اور گرفت ڈھیلی پڑ جاتی۔
آنے جانے والے لوگ کشکول میں کچھ نہ کچھ ڈالتے جا رہے تھے۔ ایک نے گلا ہوا کیلا ڈالا۔

اس کی نظریں کیلے سے چپک گئیں

پچکے ہوئے سیاہ چھلکے والے کیلے کا ایک سرا پھٹ گیا تھا جس سے گلا ہوا گودا باہر نکل آیا تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے کیلے کے اس سرے پر کسی نے پکا ہوا بلغم تھوک دیا ہو۔اس سوکھے سیاہ رنگت والے پچکے ہوئے چھوٹے سے کیلے کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے کشکول میں کچلی ہوئی کوئی چوہیا ڈال دی ہو۔

ایک صاحب نے اپنی پلیٹ کا جوٹھن سمیٹ کر کشکول میں پلٹ دیا۔دال اور دہی میں سنا ہوا چاول دیکھ کر اسے لگا جیسے کسی نے کشکول میں اُلٹی کر دی ہو۔اسے محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھ میں کشکول نہیں کوئی ڈسٹ بین ہو۔کراہت کا ایک بھپکا اس کے اندرون تک سرایت کر گیا۔

کسی نے ایک سکہ پھینکا مگر سکے سے کھن کی آواز نہیں ابھری۔

کوئی میلا کچیلا مڑا تڑا گلا ہوا ایک روپے کا نوٹ ڈال گیا۔

ایک صاحب ایک گھسی ہوئی اٹھنی ڈال گئے۔

اسے محسوس ہوا جیسے لوگ اسے اندھا بھی سمجھ رہے ہیں۔اندھا سمجھنے والوں کی جانب اس کی آنکھیں اس طرح اٹھتیں جیسے وہ ان کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں گی۔

''سالا ہٹا کٹا ہو کر بھیک مانگتا ہے''۔ایک صاحب ایک گندی سی گالی پھینک کر آگے بڑھ گئے۔

اس کے بائیں ہاتھ کی مٹھی بھنچ گئی۔

ایک اور صاحب رکے اور اپنی قہر آلود نگاہوں سے اس کی جانب نفرت اور حقارت کے تیر برسا کر چل دیے۔

اس کی بھویں کھنچ گئیں۔

ایک شخص نے ترحم کی نظر سے دیکھتے ہوئے پرس سے کڑکڑاتا ہوا ایک پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور اس نوٹ کو اس کی آنکھوں کے سامنے عجب انداز سے لہرا کر کشکول

میں ڈال دیا۔

اس کے جی میں آیا کہ وہ اس نوٹ کو پھاڑ کر اس آدمی کے منہ پر دے مارے۔

آنے جانے والے کشکول میں گلے سڑے پھل، جوٹھن، گھسی ہوئی اٹھنی، چونی، سکّے، پھٹے ہوئے میلے کچیلے نوٹ، گالی، نفرت، حقارت، ترحم ڈالتے چلے گئے۔

اس کے کشکول کا وزن بڑھتا گیا اور ذہن و دل کا دباؤ بھی۔ سینے میں ایک جذبہ اٹھا اور کشکول والے ہاتھ میں سما گیا۔ ہاتھ مشتعل ہوا۔ انگلیوں کی گرفت بھی ڈھیلی ہوئی مگر کشکول ہاتھ سے جدا نہ ہو سکا۔

اس کے ذہن میں دونوں حکایتیں دوبارہ اُبھریں:

پہلی حکایت میں بادشاہ تھا جس کے شاہی خزانے میں بے شمار دولت تھی اور جس کے ہاتھ کی ٹوپیاں ہاتھوں ہاتھ بک جایا کرتی تھیں اور جن کی رقم سے اس کی ضرورتیں پوری ہو جایا کرتی تھیں۔ بادشاہ کو یہ بھی احساس تھا کہ وہ ایک بادشاہ ہے۔ بادشاہ جس کے پاس اپنی ایک حکومت ہے۔ ایک مضبوط قلعہ ہے۔ اس قلعے میں اس کے اشارے پر جان دینے والی ایک فوج ہے۔

دوسری حکایت میں ایک فقیر تھا۔ فقیر جس کے مراقبے میں خدا تھا۔ اس خدا کی بنائی ہوئی جنت تھی اور اس جنت میں بے شمار حور و غلماں تھے۔ بہشتی میوے تھے۔ کوثر و تسنیم نام کی نہریں تھیں اور ان نہروں میں شہد سے زیادہ میٹھا، دودھ سے زیادہ سفید اور برف سے زیادہ ٹھنڈا پانی تھا اور اس فقیر کو ان سب پر پورا پورا یقین تھا۔

حکایتوں کے ہمراہ یہ تفصیلات بھی ابھریں اور دیر تک دل و دماغ میں گردش کرتی رہیں۔

ان حکایتوں کے بعد ایک کہانی ابھری:

اس کہانی میں نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ ہی کوئی فقیر۔ صرف ایک آدمی تھا جو ایک ایسے گھر میں پیدا ہوا تھا جس کے اوپر چھت نہیں تھی۔ جس کی دیواروں کے پشتے کمزور پڑ گئے تھے اور جس میں رہنے والوں کے پیٹ بھی اکثر خالی رہتے تھے۔ اس بغیر چھت اور

کمزور پشتے کی دیواروں والے گھر میں پیدا ہونے والے اس آدمی کے لیے چھت بنانے اور پشتہ باندھنے اور اس کے سر پر سایہ کرنے کے لیے خالی پیٹ والوں نے بہت سارے سپنے بھی دیکھے تھے اور ان سپنوں کو حقیقت میں بدلنے کے لیے طرح طرح کے جتن بھی کیے تھے۔ خود اس آدمی نے بھی بہت ساری تعبیریں کی تھیں۔ اپنا دماغ لگایا تھا۔ ہاتھ پیر چلائے تھے۔ انگلیوں کے ہنر دکھائے تھے۔ جسم و جاں جھلسائے تھے۔ خون جلایا تھا مگر جس کا نہ دماغ کام آسکا تھا اور نہ ہی ہاتھوں کے ہنر رنگ لا پائے تھے۔ جس کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چیزیں چوراہوں اور نکڑوں پر پڑے پڑے سڑ گل اور ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں اور جس کے مراقبے سے بہت ساری چیزیں سرک گئی تھیں۔ خدا کا یقین بھی کھسک کر کہیں اور جا پڑا تھا۔ اب وہاں صرف ایک پیٹ رہ گیا تھا جو خالی تھا اور جس کی خشک آنتیں کُلبلا رہی تھیں۔

کشکول سے اس نے ایک ایک کر کے ساری چیزیں نکال لیں:

پہلے اس نے پانچ کا نوٹ نکالا۔ کڑکڑاتا ہوا نوٹ۔ اس نوٹ پر نگاہ پڑتے ہی اس پر پانچ پانچ روٹیاں اُبھر آئیں۔

پھر اس نے مڑا تڑا ایک روپے کا نوٹ نکالا۔ اس بوسیدہ نوٹ کی تہیں سیدھی کیں۔ اسے فرش پر رکھ کر ہتھیلی سے خوب اچھی طرح دبا دبا کر اس کی سلوٹیں مٹائیں اور پھر اسے پانچ روپے کے کڑکڑاتے ہوئے نوٹ اور ایک کاغذ کے بیچ میں احتیاط سے رکھ کر اپنی اوپر والی جیب میں رکھ لیا۔

مڑے تڑے نوٹ کے بعد اس نے سکّے نکالے۔ زیادہ تر سکّے گھسے ہوئے تھے۔ نمبر مٹ چکے تھے اور بعض تو کھوٹے بھی تھے۔ بازار میں ان کا چلنا مشکل تھا۔ پھر بھی اس نے انھیں اپنی جیب میں رکھ لیا۔ جیب میں رکھنے سے پہلے اسے اپنے محلے کا دکاندار یاد آ گیا تھا جس کی اندھی بیوی بھی کبھی کبھار دکاندار کی غیر موجودگی میں گلّے پر بیٹھ جایا کرتی تھی۔

آخر میں اس نے کیلے کو نکالا۔ اسے غور سے دیکھا۔ واقعی وہ پکی ہوئی چوہیا معلوم ہو رہا تھا اور بلغم کی طرح اس کا گودا باہر نکل آیا تھا۔ دیر تک وہ اس کیلے کو دیکھتا رہا۔

اس کیلے پر آس پاس کے دوسرے سینئر بکھاریوں کی نظریں بھی مرکوز ہوگئی تھیں جن کے کشکول میں ابھی تک کوئی چوہیا نہیں پڑی تھی۔ان میں سے کچھ آنکھیں بڑی باریکی سے اس کا معائنہ کررہی تھیں۔اس کے چہرے کے ہاؤ بھاؤ ، اس کے اندر کی کیفیات،اس کی انگلیوں کی کپکپاہٹ اور گرفت کے ڈھیلے پن پر بھی ان کی نظر تھی۔

اس نے اِدھر اُدھر اُچٹتی سی ایک نگاہ ڈال کر کیلے کے چھلکے کو الگ کیا اور بلغم نما پورے کا پورا گودا اپنے منہ میں ڈال لیا۔

پارکنگ ایریا

محلّے میں پہنچ گیا تھا مگر اسے خالہ کا مکان نہیں مل رہا تھا۔

چار پانچ سال پہلے جب وہ بٹلہ ہاؤس آیا تھا تو گھر آسانی سے مل گیا تھا۔ خالو نے اسے بس اتنا بتایا تھا کہ مکان مسجد کے پاس ہے اور آنگن میں اشوک کا ایک پیڑ کھڑا ہے۔

مسجد کے پاس پہنچ کر آنگن میں پیڑ والا مکان وہ چاروں طرف ڈھونڈتا پھر رہا تھا مگر اس علاقے میں کوئی بھی ایسا مکان نظر نہیں آ رہا تھا جس کے آنگن میں پیڑ ہو۔ پیڑ کیا، وہاں تو اسے کوئی آنگن بھی دِکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اسے پریشان دیکھ کر ایک بزرگ شخص جو کرتا پاجامہ اور ٹوپی پہنے ایک عمارت کے گیٹ کے پاس لوہے کی کرسی ڈالے بیٹھے تھے، اسے مخاطب کر کے بولے

''صاحبزادے آپ کو کس کے گھر جانا ہے؟''

''خلیل اللہ صاحب انجینئر کے یہاں۔'' اس نے انجینئر پر زور دے کر جواب دیا۔

''وہی خلیل اللہ تاجو ایم۔سی۔ڈی میں ہیں؟''

''جی ہاں، وہی۔'' اسے کچھ اطمینان سا محسوس ہوا۔

''آپ تو ان کے فلیٹ کے سامنے ہی کھڑے ہیں۔ اس بلڈنگ کی دوسری منزل کا داہنی جانب والا فلیٹ انھی کا ہے۔''

''یہ ہے ان کا مکان؟ پہلے تو یہ ایک منزلہ مکان تھا اور اس کے آنگن میں اشوک کا

ایک پیڑ کھڑا تھا۔ میں تو اسے ہی ڈھونڈ رہا تھا۔'' اس کی آنکھیں حیرت سے اس عمارت کو گھورنے لگیں۔

''میاں! اس مکان کو فلیٹ میں تبدیل ہوئے بھی ایک عرصہ ہو گیا۔ لگتا ہے آپ کافی دنوں بعد ادھر تشریف لائے ہیں۔''

''جی، میں کوئی چار پانچ سال بعد آیا ہوں۔''

''چار پانچ سال! یہاں تو روز کچھ نہ کچھ بدل جاتا ہے۔''

''اچھا!'' اس کی نگاہیں ایک لمحے میں چاروں طرف دوڑ گئیں۔ محلّے کے بدلاؤ کا نقشہ اور بھی نمایاں ہو گیا۔

''چچا میاں! کون سی منزل پر بتلایا تھا؟'' آس پاس میں ہوئی غیر معمولی تبدیلی اور حیرت و استعجاب کی شدّت نے اس کے دماغ میں ایسی اُتھل پُتھل مچادی تھی کہ کچھ دیر پہلے کی سنی ہوئی بات بھی ذہن کے پردے سے محو ہو گئی تھی۔

''دوسری منزل پر داہنی جانب والا فلیٹ۔''

''شکریہ!'' وہ سامنے والی عمارت کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے داہنی طرف والی کال بیل کا بٹن دبا دیا۔

کوئی آٹھ دس منٹ بعد دروازہ کھلا۔ وہ بھی آدھا۔ ادھ کھلے دروازے کی اوٹ سے ایک لڑکی بولی۔

''کس سے ملنا ہے؟''

''جی، خلیل اللہ صاحب سے۔''

''وہ تو ابھی آفس سے نہیں آئے ہیں۔ شام کے وقت پہنچتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ لڑکی دروازہ بند کرنے لگی۔

''سنیے تو۔۔'' اس نے روکا۔

''جی، کہیے۔'' لڑکی کے لہجے میں کسی قدر سختی در آئی تھی۔

''خالہ، مرا مطلب ہے ان کی بیگم صاحبہ ہیں؟''

''ہیں تو مگر وہ لیٹی ہوئی ہیں۔ شام میں آیئے گا۔''

''دیکھیے۔ میں دیوریا سے آیا ہوں اور میرا نام اشف۔۔۔'' قبل اس کے کہ وہ اپنا پورا نام بتاتا دروازہ بند ہو گیا۔

اسے ایک دھکا سا لگا۔ وہ نیچے سے اوپر تک ہل گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی ہو۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ایسا کچھ ہوگا۔ بلکہ اس کے ذہن میں تو کچھ اور ہی نقشہ تھا۔ بُو خالہ کے گھر والا تازہ تازہ رسپشن بسا ہوا تھا۔ بُو خالہ اور خلیل اللہ خالو کی بیوی شبّو خالہ دونوں سگی بہنیں تھیں۔ بُو خالہ ضلع دیوریا کے ایک قصبہ زیرادیئی میں بیاہی گئی تھیں۔ کچھ دنوں پہلے اسے ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ دستک دیتے ہی بچے باہر آ کر اس سے لپٹ گئے تھے۔ وہ ایک دن کے لیے گیا تھا مگر خالہ اور بچوں نے ضد کر کے اسے کئی دنوں تک روک لیا تھا۔ بار بار اسے اپنا قصبہ بھی یاد آ رہا تھا جہاں پہلی دستک میں دروازہ کھل جاتا ہے اور پنوں کے کھلتے ہی آنے والے کو اندر آنے کے لیے کہا جاتا ہے اور بنا کچھ پوچھ تاچھ کے پانی پیش کر دیا جاتا ہے اور پھر۔۔۔ کچھ دیر تک وہ اس لوہے کے بند دروازے کو دیکھتا رہا اور اپنے قصبے اور بُو خالہ کے گھر کو یاد کرتا رہا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ زینے سے اتر کر سیدھے اسٹیشن چلا جائے مگر خالو سے ملنا ضروری تھا۔ جی کڑا کر کے وہ دُکھی من اور بوجھل پیروں سے نیچے اتر آیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ وقت کس طرح بتائے؟ شام ہونے میں ابھی ایک سوا گھنٹہ باقی تھا۔ گیٹ سے نکل کر وہ سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ اس بزرگ شخص کی آواز جس نے خالو کے مکان کا پتا بتلایا تھا، کانوں سے ٹکرائی۔

کیا بات ہے؟ آپ بہت جلدی واپس آ گئے۔''

''جی دروازہ بند ہے۔''

''آپ نے کھٹکھٹایا نہیں؟''

''کھنکھٹایا تھا۔شاید گھر والے گہری نیند سو رہے ہیں۔''

''کمال ہے!اس وقت تک سو رہے ہیں؟''بزرگ شخص نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے انھوں نے اس کا جھوٹ پکڑ لیا ہو۔کھٹاک کی آواز دوبارہ اس کے ذہن میں گونج پڑی۔

قدرے توقف کے بعد اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ بزرگ بولے

''تو کیا آپ لوٹ جائیں گے؟''

''نہیں،خالو سے ملنا ضروری ہے۔اس لیے انتظار کروں گا۔''

''آیئے،میرے پاس بیٹھ جایئے۔آپ کے ساتھ کچھ میرا بھی وقت کٹ جائے گا؟''

آگے بڑھ کر وہ ایک اور کرسی اٹھا لائے۔

''خلیل صاحب سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟''اس کی طرف کرسی بڑھاتے ہوئے بولے

''میں ان کی بیوی کی ممیری بہن کا بیٹا ہوں۔میرا مطلب ہے خلیل صاحب میرے خالو لگتے ہیں''

''اچھا ہوا کہ آپ نے دوسرا جملہ بھی بول دیا ورنہ اس طرح کے درمیانی حوالے اکثر راستے کی دیوار بن جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو منزل۔۔۔۔خیر چھوڑیے،یہ بتایئے کہ آپ کیا کرتے ہیں؟ کہاں کے رہنے والے ہیں اور یہاں کیوں کر آنا ہوا ہے؟''

''ایک ساتھ تین تین سوال؟اسے کچھ عجیب سا لگا۔پھر یہ سوچ کر کہ وقت گزارنے کے لیے یہ سوال برے نہیں ہیں۔اس نے جواب دینا شروع کر دیا۔

''میں ضلع دیوریا کے پاس کے ایک قصبے کا رہنے والا ہوں۔ابھی ابھی ایم۔اے کا امتحان پاس کیا ہے۔رزلٹ نکلنے ہی والا ہے۔جامعہ سے ریسرچ کرنے کا ارادہ ہے،اسی

سلسلے میں یہاں آنا ہوا ہے۔ خلیل اللہ خالو سے رہائش وغیرہ کے متعلق بھی کچھ بات کرنی ہے، اور ابو کا ایک خط بھی ان تک پہنچانا ہے، لہٰذا ان کا انتظار کرنا ضروری ہے۔''

''ہاں، تب تو انتظار کرنا ہی پڑے گا، جامعہ میں تو ہاسٹل کی قلت ہے، اس لیے اس بات کا قوی امکان ہے کہ آپ کو باہر رہنا پڑے۔''

''کوئی بات نہیں، گھر سے جب نکلنا ہے تو ہاسٹل کیا اور باہر کیا۔ البتہ ایک بات کی خوشی ضرور ہے کہ یہاں خالو کا گھر ہے تو کبھی کبھار گھر کا مزا بھی مل جایا کرے گا۔ چچا میاں کیا آپ یہیں رہتے ہیں؟''

''ہاں، میں اسی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہتا ہوں، میرا فلیٹ کافی اوپر ہے۔ اترنے چڑھنے میں سانس پھول جاتی ہے، اس لیے بار بار اوپر نہیں جاتا۔ یہاں وقت بھی اچھا کٹ جاتا ہے۔''

''آپ کے گھر میں اور کوئی نہیں ہے کیا؟''

''ہے کیوں نہیں؟ ماشاءاللہ دو دو بیٹے ہیں۔ بہوئیں ہیں۔ پوتے پوتیاں ہیں۔''

''تو ماشاءاللہ بھرا پُرا گھر ہے۔ مکان آپ کا اپنا ہے یا کرائے پر لیا ہے؟''

''ہے تو اپنا ہی مگر مکان نہیں، فلیٹ ہے۔''

''مکان اور فلیٹ میں کوئی فرق ہے کیا؟ میں تو دونوں کو ایک ہی سمجھ رہا ہوں۔''

''آپ دہلی میں نہیں رہتے نا، اس لیے ایسا سمجھ رہے ہیں۔ اگر دہلی یا کسی اور بڑے شہر میں رہ رہے ہوتے تو آپ کو مکان اور فلیٹ کا فرق ضرور معلوم ہوتا۔''

''کیا فرق ہے؟'' فرق جاننے کا اس میں تجسس پیدا ہوا۔

''مکان اسے کہتے ہیں جس کی زمین اور چھت دونوں اپنی ہوتی ہے۔ اس میں کسی کا کوئی حصہ نہیں ہوتا اور فلیٹ میں نہ فرش اپنا ہوتا ہے نہ ہی چھت اپنی ہوتی ہے۔ بس دونوں کے درمیانی حصے پر مالکانہ اختیار یا قبضہ ہوتا ہے۔

''پھر تو واقعی دونوں میں کافی فرق ہے۔''

''ایک فرق اور ہے میاں۔''

''وہ کیا؟''

''فلیٹ تو مل جاتا ہے مگر مکان ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتا اور اب تو دلّی کا یہ حال ہے کہ یہاں مکان کا کوئی خواب بھی نہیں دیکھتا اور ایک فرق یہ بھی ہے کہ مکان رکھنے کے لیے قلب و ذہن میں کشادگی ضروری ہے جو بدقسمتی سے رخصت ہوتی جارہی ہے۔''

''کیوں؟''

''کوئی ایک وجہ ہو تو بتاؤں۔''

''پھر بھی، ایک آدھ تو بتا ہی دیجیے۔''

''ایک تو یہی ہے کہ ادھر اُدھر کا دباؤ ہمارے دل و دماغ کو اپنے شکنجوں میں کستا جارہا ہے۔ دوسری یہ کہ ہم الگ تھلگ رہنے کے عادی بنتے جارہے ہیں اور ایک یہ بھی کہ فطری آب و ہوا کے بجائے ہمیں کولر اور اے۔سی کی ہوا زیادہ بھانے لگی ہے۔''

جس شخص کو تھوڑی دیر پہلے وہ چوکیدار یا چوکیدار جیسا آدمی سمجھ رہا تھا، وہ اچھا خاصا دانشور لگنے لگا تھا۔ اس کی باتیں سن کر وہ اپنے اس دباؤ کو بھولتا جارہا تھا جو خالو کے فلیٹ کے پٹوں کے ''کھٹاک'' سے اس کے دل و دماغ پر طاری ہو گیا تھا۔ اس میں اب اس کی دلچسپی بڑھنے لگی تھی۔ اس نے اس بزرگ کے سراپے کا جائزہ لینا شروع کیا تو آنکھوں میں بہت سے سائے لہرانے لگے۔ اسے محسوس ہوا جیسے ان کے چہرے کے پیچھے کوئی اور بھی چہرہ چھپا ہوا ہے۔

''چچا میاں! آپ نے اپنے مشغلے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟'' اس نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''میاں آپ نے پوچھا ہی کب کہ بتاتا۔ اب جبکہ آپ کی دلچسپی میری جانب بڑھی ہے تو بتاتا ہوں کہ میں جامعہ میں درس و تدریس سے منسلک تھا۔ پینتس سال تک خدمت انجام دینے کے بعد اب سبکدوشی کی زندگی گزار رہا ہوں۔''

''آپ سے ایک ایسا سوال بھی کرنے کو جی چاہ رہا ہے جو خود مجھے بھی اٹ پٹا لگ رہا ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو پوچھوں؟''

''ضرور پوچھیے۔ میں بالکل برا نہیں مانوں گا۔ آپ کے اس طرح کے سوال کے لیے میرا ذہن پہلے سے تیار بھی ہے کہ آپ کی نظریں آلریڈی اس کا اشارہ مجھے دے چکی ہیں۔''

''آپ اس پارکنگ ایریا میں اپنا زیادہ وقت صرف اس لیے بتاتے ہیں کہ آپ کو اوپر چڑھنے اُترنے میں پریشانی ہوتی ہے یا کوئی اور وجہ بھی ہے؟

یہ سوال سن کر اس بزرگ نے اپنی آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں جیسے اس نے اس کی اصل وجہ جان لی ہو۔ کچھ دیر تک وہ اسے گھورتے رہے، پھر بولے۔

''صاحب زادے! آپ کافی ذہین معلوم ہوتے ہیں اور قیافہ شناس بھی۔ اس لیے اب آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بولوں گا اور بولوں گا بھی تو آپ یقیناً اس جھوٹ میں چھپے سچ کو جان لیں گے۔ سچ یہ ہے برخوردار کہ تنگی نے مجھے فلیٹ سے اتار کر اس پارکنگ میں پہنچا دیا ہے۔ اگر دیر تک میں اوپر کمرے میں رہتا ہوں تو میرے پوتے پوتیوں کی پڑھائی اور ان کی پرائیویسی دونوں متاثر ہوتی ہیں اور میں نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوتا ہوں۔ اس لیے میں اپنے کمرے میں جو کہنے کے لیے تو مرا کمرہ ہے مگر وہ ڈرائنگ روم بھی ہے اور اسٹڈی روم بھی، بہت کم جاتا ہوں اور اس وقت جاتا ہوں جب میرا وہاں جانا ناگزیر ہو جاتا ہے اور زیادہ وقت یہاں بتاتا ہوں۔ مانا کہ یہاں صفائی کم ہے۔ آس پاس میں کوڑا کباڑ بھی پڑا ہوا ہے جس کی طرف آپ کی نظریں بار بار چلی جا رہی ہیں، پھر بھی یہاں دم نہیں گھٹتا بلکہ کھلا پن محسوس ہوتا ہے اور اوپر کے مقابلے میں یہاں بیٹھنا بھی اچھا لگتا ہے کہ آتے جاتے کچھ لوگوں سے سلام دعا بھی ہو جاتی ہے۔'' بات کرتے کرتے وہ ایک دم سے خاموش ہو گئے۔ اسے محسوس ہوا جیسے ان کی آنکھوں میں کچھ اتر آیا ہو۔

اسے اس کے دادا یاد آ گئے۔ ان کی بیٹھک میں دن بھر محلے کے لوگوں کا آنا جانا لگا

رہتا ہے اور رات میں گھر کے بچے انھیں گھیر کر بیٹھ جاتے ہیں۔ دیر تک کہانی سننے اور سنانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ بیچ بیچ میں مونگ پھلی اور چائے وغیرہ کا دور بھی چلتا رہتا ہے۔

''چچا میاں آپ کہاں کھو گئے؟'' اس نے بزرگ کی خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی اس کے سوال پر وہ ایک لمبی سانس لے کر بولے۔

''میاں! کبھی ہمارے پاس بھی اپنا مکان تھا۔ یہ پوری زمین ہماری تھی۔ گھر کے تمام افراد کے پاس ان کے اپنے کمرے تھے۔ بلکہ ایک آدھ کمرے ضرورت سے زیادہ بھی تھے۔

''پھر آپ نے اسے فلیٹ میں کیوں بدل دیا؟'' اس کا تجسس بڑھنے لگا

''میں نے نہیں بدلا۔ یہ کام میرے بیٹوں نے کیا۔ انھوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اسے کسی بلڈر کو سونپ دوں کہ وہ اس زمین کی اچھی قیمت کے ساتھ ساتھ مفت میں ہمیں ایک فلیٹ بھی دے گا۔ انھوں نے مجھے اس طرح بھی سمجھایا کہ یہ کام سبھی کر رہے ہیں۔ کوئی اکیلا میں نہیں کروں گا اور کچھ ایسی ضرورتیں بھی میرے سامنے رکھ دیں کہ اپنے دل و دماغ کے دباؤ کے باجود میں نا نہ کہہ سکا۔ اس طرح ہمارا مکان جو کافی کشادہ تھا دو کمروں کے فلیٹ میں تبدیل ہو گیا۔

''دیر تک آپ کا یہاں رہنا آپ کے بچوں کو کیا اٹ پٹا نہیں لگتا؟''

''پتا نہیں، ویسے کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ وہ اور ان کے بچے مجھ سے پوچھیں کہ میں یہاں کیوں پڑا رہتا ہوں مگر آج تک کسی نے بھی یہ سوال مجھ سے نہیں کیا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ میری بیوی یہ دن دیکھنے سے پہلے ہی یہاں سے رخصت ہو گئیں، ورنہ پتا نہیں ان بیچاری کا کیا حال ہوتا؟''

ان کی آواز بند ہو گئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ آنسو بیوی کی جدائی کے غم کے تھے یا بچوں کی بے اعتنائی کے یا اس کی کوئی اور وجہ تھی ٹھیک سے مجھ پر واضح نہ ہو سکا۔

کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے انھوں نے پھر بولنا

شروع کیا" بعد میں جب میں نے اپنے بیٹوں سے تنگی کی شکایت کی تو انھوں نے میرے سامنے ایک نئی منطق رکھ دی۔

"وہ کیا منطق تھی؟"

"میں نے جب ان سے کہا کہ دوسو گز کا مکان اب 100 گز میں سمٹ کر رہ گیا ہے تو بولے۔

"ابا ہماری زمین تنگ نہیں ہوئی ہے بلکہ اور کشادہ ہوگئی ہے۔ پہلے اس کا رقبہ صرف دوسو گز یعنی اٹھارہ سو اسکوائر فٹ تھا۔ اب وہ رقبہ دوسو گز سے بڑھ کر ہزار گز یعنی اٹھارہ ہزار اسکوائر فٹ ہوگیا ہے۔ پہلے اس جگہ صرف ہمارا یعنی ایک کنبہ رہتا تھا، اب کئی خاندان آباد ہوگئے ہیں۔"

"ان کی منطق سن کر میرے منہ سے تو کچھ نہیں نکلا البتہ میری آنکھیں ان کی طرف مرکوز ہوگئیں۔ دھیرے دھیرے ان کے دیدوں میں اس منطق کا کھوکھلا پن سمٹ آیا تھا اور ان کی پلکیں کسی بوجھ سے جھکتی چلی گئی تھیں۔"

"چچا میاں! چاہے ان کی نیت صاف نہ رہی ہو مگر یہ منطق کوئی غلط تو نہیں لگتی؟"

"منطق صحیح بھی ہو تب بھی اس سے تنگی تو دور نہیں ہوجاتی۔ ہاں کسی کو بسانے کا احساس ضرور کچھ خوشی دے سکتا ہے مگر اس طرح کی خوشی ایسے میں کب تک قائم رہ سکتی ہے جب کہ دُکھ کا شکنجہ روز بہ روز جسم و جان کو کستا جارہا ہو۔ میاں سچ تو یہی ہے کہ ہماری زمین ہم پر تنگ ہوگئی۔ ہماری گھٹن بڑھ گئی۔ ایک ہماری ہی کیا، یہاں جتنے لوگ رہتے ہیں زیادہ تر اس گھٹن اور تنگی کے شکار ہیں۔ آدھے فلیٹس تو ایسے ہیں جہاں سورج کی روشنی پہنچتی ہی نہیں۔ ہوا کا گزر بھی مشکل سے ہوتا ہے۔ کچھ کمروں میں تو بالکنی تک نہیں ہے اور جن کمروں میں ہے بھی تو وہ اتنی تنگ اور پتلی ہے کہ اس میں ٹھیک سے لوہے کی ایک فولڈنگ کرسی بھی نہیں پڑ پاتی۔ برسات میں کپڑے آئرن سے سکھانے پڑتے ہیں اور بجلی اتنی پھنکتی ہے کہ اللہ کی پناہ! اکثر بالکنیوں سے بجلی کے موٹے موٹے تار چپک کر گزرتے ہیں جن کا خوف

کسی سانپ کے خوف کی طرح ہر وقت سروں پر مسلط رہتا ہے۔ پتا نہیں ان میں سے کوئی کب پھنکار مار دے اور ہم میں سے کوئی پیلا پڑ جائے۔''

''چچا میاں! آخر اس علاقے کو یہاں کے لوگوں نے اتنا گنجان کیوں بنا دیا؟ کسی نے دباؤ تو ڈالا نہیں ہوگا کہ آپ اپنی کشادہ زمینوں کو اپنے اوپر قبر کی طرح تنگ کر لیں؟

''میاں! جب میں اس کرب سے دوچار ہوا تو اس مسئلے پر بہت سوچا۔ یہ سوال جو ابھی آپ نے مجھ سے کیا ہے میرے ذہن میں بھی ابھرا اور بار بار ابھرا اور اس کا جواب مجھے یہ ملا کہ بظاہر تو ایسا نہیں لگتا کہ کسی نے فورس کیا ہو یا دباؤ ڈالا ہو لیکن جو لوگ اس علاقے میں رہتے ہیں یا رہنا پسند کرتے ہیں ان پر اور اپنی زمینی حقیقت پر غور کیا جائے تو کوئی نہ کوئی دباؤ بھی ضرور نظر آ جائے گا۔''

''آپ کو تو وہ دباؤ نظر آیا ہوگا؟''

''ہاں، آیا تو ہے؟

''تو اس پر کچھ روشنی ڈالیے نا۔''

''میاں! آپ نے یہ کہاوت تو سنی ہوگی ''چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا۔ یعنی جتنی چادر ہو پاؤں اتنا ہی پھیلانا چاہیے، ادھر جو لوگ رہتے ہیں یا رہنے کی کوشش کرتے ہیں انھیں اس حقیقت کا احساس ہے کہ ان کے پاس جو چادر ہے وہ چھوٹی ہے۔ اتنی چھوٹی کہ پورے پاؤں پھیلا نہیں سکتے۔ نتیجتاً انھیں اپنے پیروں کو موڑ کر یا سکوڑ کر رکھنا پڑتا ہے۔ پیروں کو موڑنے میں گھٹنے اور ناک تو ٹکرائیں گے ہی اور جب یہ صورت حال پیدا ہوگی تو گھٹن تو ہوگی ہی۔ پھر یہاں کی تنگی نے مزید تنگی پیدا کر دی ہے۔''

''اس کا مطلب کیا ہوا، چچا میاں؟''

''مطلب یہ ہے میاں کہ کم زمین ہونے کے سبب ہر آدمی اپنی زمین کو دائیں بائیں سے کچھ بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ہوڑ میں لوگ ایک دوسرے سے سبقت بھی لے جانے کی سعی کرتے ہیں۔ نتیجے میں روشن دان کھلے ہونے کے باوجود بند رہتے

ہیں۔کھڑکیاں بے مصرف ہو جاتی ہیں۔مکانوں کے پچھے راستوں پر آ جاتے ہیں۔اوران پچھوں پر بالکنیاں بن جاتی ہیں اوراس طرح وہ راستہ جو نیچے چوڑا ہوتا ہے اوپر آتے آتے اتنا تنگ ہو جاتا ہے کہ ہوااور روشنی دونوں کا گلا بھنچ جاتا ہے۔

تنگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان علاقوں میں وہ لوگ بھی اب آنا پسند کرنے لگے ہیں بلکہ اس طرف بھاگنے لگے ہیں جو کشادہ علاقوں میں بسے ہوئے ہیں یا جو اُدھر بسنے کی سکت رکھتے ہیں۔ایسے لوگوں میں ترقی پسند خیال اور سیکولر مزاج والے لوگ بھی شامل ہیں۔''

''ایسے لوگ بھی؟''

''ہاں، ایسے لوگ بھی۔دہشت کا گرد باد جب لہراتا ہے تو مضبوط سے مضبوط فلسفے کا پیڑ بھی اُکھڑ جاتا ہے۔یہاں تک کہ ایمان ویقین کا برگد بھی گر پڑتا ہے۔''

''ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'' حالات کو سمجھنے میں اس کی دلچسپی بڑھنے لگی۔

''اس لیے کہ لوگ اُدھر خود کو محفوظ نہیں سمجھتے۔''

''محفوظ کیوں نہیں سمجھتے؟''

''اس لیے کہ دھمک کہیں بھی ہو، ان کی کھڑکیاں لرز جاتی ہیں اور کبھی کبھی تو ایسی لرزتی ہیں کہ ہفتوں دل ودماغ پر لرزہ طاری رہتا ہے۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

''اس کیوں کو جاننے کے لیے یہاں کی تاریخ اور جغرافیہ میں دور تک جانا ہوگا اور کئی سو سالہ تہذیب ومعاشرت کے سرد وگرم کو سمجھنا ہوگا۔یہ ایسا سوال ہے کہ اس کا جواب جاننے میں ذہن جھلسنے اور دل بیٹھنے لگتا ہے۔اس کا جواب ایک دو جملے میں دیا بھی نہیں دیا جا سکتا۔اس لیے فی الحال تو ہمیں لوگوں کے ادھر آنے کی وجوہات پر غور کرنا چاہیے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بڑی اور صاف ستھری کالونیوں میں ہمارے لیے مرنے کے بعد کا انتظام نہیں ہے۔ہمارے ملک میں کالونیاں اکثریت کی آبادی کو ذہن میں رکھ کر بنائی جاتی

ہیں۔ چوں کہ ہماری اکثریت کو مرنے کے بعد کے قیام کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، انھیں مرنے کے بعد کوئی جگہ نہیں چاہیے اس لیے قبرستان کا پروو زن نہیں رکھا جاتا لیکن ہمیں تو اسکے بعد بھی دو گز زمین چاہیے، وہ اُدھر نہیں ملتی۔ اس ضمن میں ایک دل دہلا دینے والا واقعہ بھی سن لیجیے۔ میرے ایک جاننے والے بتا رہے تھے کہ ان کی کالونی میں کسی کی وفات ہوئی۔ ان کی میت آس پاس کے کسی گاؤں کے قبرستان میں لوگ دفنانے کے لیے لے گئے تو اس گاؤں کے لوگوں نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ ہماری جگہ تو پہلے ہی سے چھوٹی ہے، ہم اگر دوسروں کو بھی اس میں جگہ دینے لگے تو ہمارا کیا ہوگا۔ لوگ اس میت کو لے کر ادھر ادھر گھومتے رہے، کہیں جگہ نہ ملی تو آخر کار بڑی مشکل سے کسی علاقے میں زمین خرید کر اس میت کو ٹھکانے لگایا گیا۔ ان صاحب نے یہ بھی بتایا کہ میت کے گھر والے رو رو کر کہہ رہے تھے کہ کاش ان کے گھر میں کوئی آنگن ہوتا یا کم سے کم ان کے کمروں کا فرش ہی مٹی کا ہوتا! یہ مسئلہ ابھی اس طرف پیدا نہیں ہوا ہے۔ ایک سبب شاید یہ بھی ہے کہ زمینی صورتِ حال نے ہمیں تنگ دامانی پر مجبور کر دیا ہے۔"

"وہ کیسے"؟

وہ اس طرح کہ وسعت کے لیے وسائل چاہییں۔ وسائل وراثت میں ملتے ہیں یا پیدا کیے جاتے ہیں۔ ہم میں سے بیشتر کے پاس وراثت نام کی کبھی کوئی چیز رہی نہیں، جن کے پاس رہی بھی تو ان میں سے کچھ کی کب کی چھن گئی یا کچھ کی کھوکھلی ثابت ہوگئی اور کچھ کی بک بکا گئی۔ رہی وسائل پیدا کرنے کی بات تو پیدا کرنے میں صرف خود کا دخل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بہت ساری چیزیں درکار ہوتی ہیں اور وہ بہت ساری چیزیں بہت سی ناگفتہ بہہ صورتوں اور بہت سی مصلحتوں کی شکار ہیں۔ لہٰذا اس راستے سے بھی ہم وسائل کا حصول نہیں کر پاتے۔ ایسی صورت میں ہم وہیں جا سکتے ہیں جہاں ہمارے محدود وسائل ہمیں جانے کی اجازت دیتے ہیں۔"

"آپ کا مشاہدہ کتنا سچا لگ رہا ہے چچا میاں!"

''ایک مشاہدہ میرا اور بھی ہے برخوردار؟''

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ اس بڑھتی ہوئی آبادی اور سمٹتی ہوئی زمین نے جامعہ جیسے تعلیمی علاقے میں بھی تاجرانہ ذہنیت پیدا کرنی شروع کر دی ہے۔''

''بھلا وہ کیسے؟'' اس کا لہجہ اور بھی متجسس ہو گیا۔

''وہ اس طرح کہ فلیٹوں کی مانگ اور نئی زندگی کے مطالبوں نے درس و تدریس سے جڑے اساتذہ تک کو بھی زمینی کاروبار اور مکان کے لین دین کے دھندے میں لگا دیا ہے۔ اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی بھی پراپرٹی کی دلالی کے پیشے میں کود پڑا ہے۔ اپنی زمین کا رقبہ بڑھا کر خود کی رہائش کو تنگ کرنے، آس پاس کی زمینوں کو قبضانے یا انھیں بلڈروں کو دلا کر کمیشن کھانے کے چکّر میں پڑ گیا ہے اور اس تجارتی ذہنیت نے ہم سے ہمارا وہ سب کچھ چھین لیا ہے جن سے ہماری پہچان وابستہ تھی۔ اس نے ہماری اس شے کو کچل کر رکھ دیا ہے جس کی بدولت دل گداز اور آنکھیں نم ہوتی ہیں۔ اس کام میں ہمارے محلے کے بھی کافی لوگ لگے ہوئے ہیں۔ خود آپ کے خالو کا بھی یہ سائڈ بزنس بن گیا ہے۔ وہ سامنے جو کام ہو رہا ہے وہ سائڈ بھی آپ کے خالو کا ہی ہے۔ دوسری طرف طلبہ سے کرائے کی موٹی رقم وصولنے کے چکّر میں فلیٹ کے لوگ ایک کمرے میں سمٹتے جا رہے ہیں اور باقی کمرے لڑکوں کو کرائے پر دے رہے ہیں۔ انھیں یہ بھی نہیں خیال رہتا کہ گھر میں جوان بہو، بیٹیاں بھی رہتی ہیں۔ اس کے جو برے نتائج سامنے آ رہے ہیں وہ آئے دن آپ بھی اخباروں میں پڑھتے ہوں گے مگر پوچھنے اور ٹوکنے پر وہ بھی وہی منطق پیش کر دیتے ہیں جو میرے سامنے میرے بیٹوں نے پیش کی تھی اس ذہنیت سے ایک خرابی اور بھی پیدا ہو رہی ہے۔''

''وہ کیا؟

''وہ یہ کہ ایک چھوٹے سے کمرے میں پانچ پانچ چھ چھ لڑکے رہتے ہیں اور تقریباً دس دس بارہ بارہ افراد ایک Toilet استعمال کرتے ہیں۔ اس سے آئے دن سنڈاسوں کا

برا حال ہوتا رہتا ہے اور ماحول میں جو بدبو پھوٹتی ہے سو الگ۔ مکان اور محلے کا جو حشر ہوتا ہے وہ تو ہوتا ہی ہے خود ان لڑکوں کا بھی بیڑا غرق ہو رہا ہے جو ایسی حالت میں رہ کر اپنا کیریئر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور جن کا مقابلہ ان سے ہوتا ہے جو کشادہ علاقوں اور صاف ستھرے گھروں میں رہتے ہیں اور جو باقاعدہ اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھ کر تیاری کرتے ہیں۔ معاف کیجیے گا میں آپ کو چائے بھی نہیں پلا سکتا۔''

''کوئی بات نہیں، چائے میں زیادہ پیتا بھی نہیں۔''

''آج آپ کا قیام رہے گا یا آج ہی واپسی ہے۔''

''ابھی کوئی طے نہیں ہے، خالو سے ملنے کے بعد ہی کوئی پروگرام بنے گا۔''

''برخوردار برا مت ماننا مگر میں اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ خلیل صاحب کے گھر والے سوئے نہیں ہوں گے۔ انھوں نے جان بوجھ کر دروازہ نہیں کھولا ہوگا یا کھولا بھی ہوگا تو اندر بلانا ضروری نہیں سمجھا ہوگا اور لگے ہاتھوں ایک تلخ بات اور کہہ دوں کہ یہ بھی ضروری نہیں کہ رات میں وہ آپ کو۔۔۔ خیر چھوڑیے۔ معاف کیجیے گا میں ذرا صاف گو آدمی ہوں، اس لیے میں نے جو محسوس کیا، اسے بنا لاگ لپیٹ کے کہہ دیا۔''

''نہیں نہیں، اس میں معافی مانگنے کی کیا بات ہے۔ آپ نے جیسا محسوس کیا، بتا دیا۔ اچھا چچا میاں! اب میں چلوں گا۔ میں نے آپ کا کافی وقت لے لیا۔''

''کہاں جائیں گے، خلیل صاحب تو ابھی آئے نہیں؟''

''ذرا جامعہ تک جا رہا ہوں پھر آ جاؤں گا۔''

''ارے! لیجیے، وہ تو آ بھی گئے۔ خلیل صاحب! آپ کے یہ مہمان میرے پاس کب سے بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''خلیل صاحب ان کی طرف مڑے ہی تھے کہ وہ اٹھ کر تیزی سے ان کے پاس چلا گیا۔''

''اسلام علیکم خالو جان!''

''وعلیکم اسلام۔تم کب آئے اشفاق؟'' اس کے سلام کے جواب کے ساتھ ہی ان کے منہ سے یہ سوال اچھل پڑا۔شاید اس کا وہاں بیٹھنا خلیل صاحب کو اچھا نہیں لگا تھا۔

''بس تھوڑی دیر پہلے''۔اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

''دہلی یوں اچانک! پہلے سے کوئی اطلاع نہیں؟''

''اچانک ہی پروگرام بن گیا۔''

''کوئی خاص کام؟''

''جی،سب کی یہی رائے بنی کہ میں ریسرچ جامعہ سے کروں سو کچھ ضروری معلومات کے سلسلے میں آنا پڑا۔''

'' اچھا،آؤ گھر چلیں۔''

''جی''

وہ خالو کے پیچھے ہولیا۔خالو کا برتاؤ دیکھ کر اسے اچھا لگا کہ اُس سے پارکنگ ایریا والے بزرگ کا impression غلط ثابت ہو رہا تھا۔

وہ خالو کے ساتھ جیسے جیسے ان کے فلیٹ کے قریب پہنچ رہا تھا ایک عجیب طرح کی الجھن سے دوچار ہوتا جا رہا تھا۔من ہی من میں دعا کر رہا تھا کہ صفیہ سے فوراً سامنا نہ ہو،خواہ مخواہ بے چاری کو سب کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا اور خود وہ بھی embarrassing situation میں آجائے گا۔

''میں ابھی آیا'' اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خلیل صاحب اندر چلے گئے۔تھوڑی دیر کے بعد کمرے کی طرف آتے ہوئے ایک سے زیادہ پیروں کی آہٹ محسوس ہوئی۔اس کے دل کی کیفیت دگرگوں ہونے لگی۔ایسا لگنے لگا جیسے غلطی صفیہ کی بجائے اس سے ہوئی ہو۔وہ آنے والی سچویشن کے لیے اپنے کو تیار کر ہی رہا تھا کہ ایک دم سے خالو اور خالہ اندر آگئے۔ان کے ساتھ صفیہ کو نہ دیکھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔

اس کے خالہ کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ خالہ نے اس ٹرے کو میز کے اوپر رکھ دیا۔ ٹرے اتنی بڑی تھی کہ اس کا ایک طرف کا کنارہ میز سے تھوڑا باہر نکل گیا۔ ٹرے میں تین خوبصورت پیالیاں تھیں جن کے اندر سے گرم چائے کی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ایک تشتری میں نمکین اور دوسری میں بسکٹ تھے۔ ٹرے میں کانچ کا ایک گول سا ڈبا بھی تھا جس میں کئی خانے بنے ہوئے تھے اور ان خانوں میں اوپر تک کاجو، کشمش، بادام، اخروٹ اور پستہ بھرے ہوئے تھے۔

''لو کھاؤ'' خالہ کانچ کے ڈبے سے ڈھکن اتارتی ہوئی بولیں۔

اس نے بادام کی ایک گری اٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لیا

چائے کے دوران خالہ نے اس کی خیریت معلوم کی۔ امی ابو کا حال پوچھا اور اس کے آنے کا مقصد دریافت کیا۔ اس کے خوشگوار تاثرات میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

چائے پیتے ہوئے بار بار اس کی نگاہیں سامنے کی دیوار پر آویزاں قدِ آئینے پر مرکوز ہو جاتی تھیں جس میں کمرے کی ایک ایک چیز دکھائی دیتی تھی۔

ایک طرف ڈائننگ ٹیبل، اس کے اردگرد چھ کرسیاں، کرسیوں پر کشن، ٹیبل پر چند ایک اسٹینڈ، کچھ برتن، دو چار مرتبان، اور کچھ ڈبے۔

ٹیبل کے دائیں طرف کی دیوار سے لگی ایک بڑی سی شیشے کی الماری جس سے کھڑکی کا تقریباً آدھے سے بھی زیادہ حصہ ڈھک رہا تھا۔ اس الماری کے مختلف خانوں میں تلے اوپر رکھے ہوئے چینی مٹی، اسٹیل اور کچھ دوسرے میٹیریل کے برتن، ہوٹ پاٹ، کیتلی، تھرمس، کیٹلری، شیشے کے گلاس، ٹی سیٹ وغیرہ۔

ٹیبل کے بائیں جانب والی دیوار سے ٹی ایک ریک، جس کے دو خانے بند تھے اور ایک میں کئی ایک رجسٹر اور کچھ بہی کھاتے رکھے ہوئے تھے۔ جس جگہ پر صوفہ سیٹ بچھا ہوا تھا اس کے ایک طرف ایک وال ماؤنٹ تھا جس کے اوپری خانے میں میوزک سسٹم اور درمیان کے خانے میں ٹیلی وژن رکھا ہوا تھا۔ کنارے کے چھوٹے چھوٹے خانوں میں کچھ

دوسرے الیکٹرانک سامان سجے ہوئے تھے۔ پاس ہی میں ایک پتلی سی میز تھی جس پر کمپیوٹر پڑا تھا۔ کمرے کے کونوں میں کورنر اور خالی جگہوں میں کئی چھوٹے چھوٹے اسٹول تھے جن پر طرح طرح کے شوپیسز پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک بڑا سا فرج تھا جس کے اوپر بھی کچھ ڈبے نظر آرہے تھے۔ اس کا انبھاک دیکھ کر خالو بول پڑے۔

''روم ذرا چھوٹا ضرور ہے مگر اس کی capicity بہت ہے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ اس نے اپنے اندر کیا کیا سمیٹ رکھا ہے۔''

''کچھ الیکٹرونک گڈس تو ابھی ڈبوں میں بند ہیں۔ بچوں کو فرصت ہی نہیں ملتی کہ کھول کر انھیں سجادیں'' خالہ بھی بول پڑیں۔

صفیہ کے نہ آنے سے اس کی الجھن تو دور ہوگئی تھی مگر یہ توقع موجود تھی کہ وہ آئے گی اور اپنی غلطی پر شرمندگی کا اظہار کرے گی اور خالہ بھی اس کی اُس حرکت کی صفائی دیں گی۔''

اس نے جب بتایا کہ اس کا جامعہ سے ریسرچ کرنے کا ارادہ ہے تو خالہ بولیں،

''یہ تو اچھی بات ہے کہ تم نے ایم۔اے۔ کرلیا اور اب جامعہ میں پڑھنا چاہتے ہو مگر کم بخت اس یونی ورسٹی کا برا حال ہوگیا ہے۔ داخلہ بڑی مشکل سے ملتا ہے اور نئے وی سی اتنے سخت ہیں کہ کوئی کسی کی سفارش بھی نہیں سنتا اور اگر کسی طرح داخلہ مل بھی گیا تو ہاسٹل نہیں ملتا۔ بڑی مصیبت کا کام ہے یہاں پڑھنا بھی۔'' خالہ نے ایک عجیب سے اضطراب کے ساتھ یہ جملے ادا کیے۔

یکا یک اُس کی آنکھوں کے سامنے ابّو کا وہ خط کھُل گیا جو خالو کے نام لکھا گیا تھا اور جو اب تک اُس کی جیب میں پڑا ہوا تھا:

بھائی جان! آداب

ہماری دلی خواہش ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اشفاق اللہ کی تربیت بھی ہو جائے۔ اس کام کے لیے جامعہ سے بہتر جگہ اور کون سی ہوسکتی ہے اور وہاں آپ کی سرپرستی بھی حاصل ہو جائے گی۔

کوشش کیجیے گا کہ ہاسٹل میں جگہ مل جائے۔نہیں تو کچھ دنوں کے لیے آپ کو زحمت کرنی پڑے گی۔اشفاق اللہ ذرا شرمیلا ہے۔وہ اس بابت خود سے کچھ نہ کہہ سکے گا اس لیے یہ بات میں آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں۔

آپا کو سلام اور بچّوں کو پیار۔

فقط والسّلام

آپ کا بھائی

نعیم اللہ

''ہمیں پتا ہے خالہ!اسی لیے تو ابّو نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کچھ دنوں تک میں کرائے کے مکان میں رہوں۔بعد میں کوئی مکان، میرا مطلب ہے فلیٹ خرید لیں گے۔تب تک چھوٹے چچا کا بیٹا عرفان اللہ بھی میٹرک کر لے گا اور اس کا بھی داخلہ جامعہ میں کرا دیا جائے گا۔''بغیر کسی توقف کے وہ فوراً بول پڑا۔

اس کا یہ جملہ سُن کر خالہ بولیں:

''نعیم کا یہ فیصلہ بہت اچھا ہے'' خالہ کے لہجے میں اضطراب کی جگہ اطمینان نے لے لی تھی۔

خلیل صاحب جو کسی خیال میں کھوئے ہوئے تھے جھٹ سے وہ بھی بول پڑے۔

''تمہارے ابّو کا یہ فیصلہ واقعی بہت اچھا ہے۔ان سے بولنا کہ ہماری جو نئی بلڈنگ بن رہی ہے اس میں جلد سے جلد ایک فلیٹ بُک کرالیں۔ابھی گنجائش ہے۔بعد میں مشکل ہو جائے گی۔اس وقت مناسب ریٹ میں بھی مل جائے گا۔اچھا اشفاق میں تو چلوں گا ایک زمین کے سودے کے سلسلہ میں کسی سے ملنا ہے۔اپنے ابّو امّی کو میرا سلام کہنا۔پھر خالہ سے مخاطب ہو کر بولے،

''اسے نئی بلڈنگ کا ایک بروشر ضرور دے دیجیے گا۔چلتا ہوں''

خلیل صاحب ایک دو قدم آگے بڑھ کر اچانک پیچھے پلٹ آئے اور اسے مخاطب

کرتے ہوئے بولے،

''اشفاق! یہ تو بتاؤ کہ تمہارے بس اڈّے والے مکان میں کون رہ رہا ہے؟ اب تو وہ کافی بوسیدہ ہو گیا ہوگا؟''

''ہاں کافی خستہ حالت میں ہے۔ اوپر کا حصہ خالی ہے۔ نیچے ایک دو کرائے دار ہیں اور ایک طرف جمو اور اس کے بال بچے رہتے ہیں۔ وہی مکان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔''

''کرایا تو بہت nominal آتا ہوگا؟''

''ہاں بہت ہی کم۔ دادا کے جان کے زمانے میں جو کرایہ تھا وہی آج بھی ہے۔''

''تم لوگ کرایہ بڑھاتے کیوں نہیں؟''

''ابّو کہتے ہیں کہ کیا بڑھانا۔ ہمارے گھر میں کچھ بے گھر لوگوں کا خاندان پل رہا ہے، یہ احساس ہی ہمارے لیے کافی ہے۔''

اس نے اپنے ابّو کی سوچ اور ان کے رویے کو دہرا دیا۔

''تمھارے ابّو غلط سوچتے ہیں۔ اتنی اچھی جگہ پر اور اتنا بڑا مکان یوں بے مصرف پڑا ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھیں اس کے متعلق کچھ اور سوچنا چاہیے۔ اچھا، اس سلسلے میں خود کسی دن آ کر ان سے ملتا ہوں۔ اچھا اب میں چلوں گا خدا حافظ۔''

خلیل صاحب کمرے سے نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی خالہ اٹھیں اور سامنے کی الماری کے پاس پہنچ گئیں۔

خلیل صاحب خدا حافظ کہہ کر جا چکے تھے۔ خالہ بروشر لانے کے لیے اُٹھ گئی تھیں لیکن اُسے صفیہ کا اب بھی انتظار تھا۔ اسے پتا نہیں کیوں یقین سا تھا کہ وہ آئے گی اور شرمندگی کا اظہار کرے گی۔ ممکن ہے شرمندگی کی وجہ سے ہی وہ نہ آ رہی ہو۔ اس کے دل کے کسی کونے سے آواز اُبھری۔ اپنی اس سوچ پر اسے قدرے اطمینان محسوس ہوا۔

خالہ الماری کے پاس سے لوٹیں تو ان کے ہاتھ میں چکنے پیپر کا ایک چھوٹا سا کتابچہ تھا۔ وہ اس کتابچے کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئی بولیں۔

''لو، یہ بروشر رکھ لو اور اسے اپنی بتّو خالہ کو بھی دکھلا دینا کہ وہ بھی ایک فلیٹ بک

کرالے"

ہاتھ میں بروشر لیتے ہی اس کے سامنے خالو کا وہ سائڈ سمٹ آیا جس کی طرف پارکنگ ایریا والے بزرگ نے کچھ دیر پہلے اشارہ کیا تھا اور جس کا نقشہ اس وقت اس بروشر میں بند تھا۔

اس کے دیدوں میں اینٹ، پتھر، ریت اور سمینٹ کا ڈھیر لگ گیا۔ کچھ دیر بعد پارکنگ والے بزرگ بھی ابھر آئے اور ساتھ ہی ان کا یہ جملہ بھی:

"تنگی نے مجھے اس پارکنگ میں پہنچا دیا ہے۔"

اُسے محسوس ہوا جیسے تنگی نے وسعت پالی ہو اور اس پارکنگ ایریا میں کچھ اور کرسیاں پڑ گئی ہوں۔

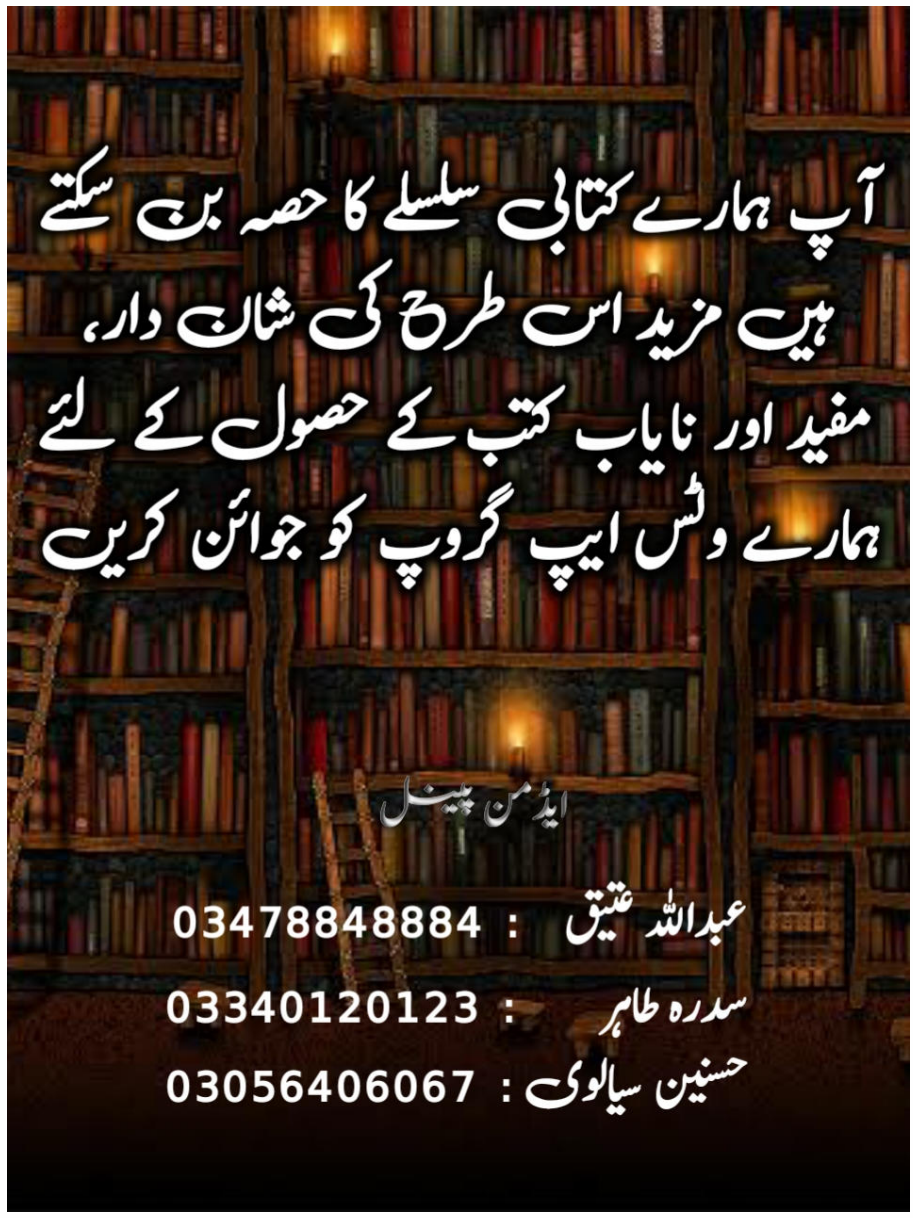

تصویرِ تختِ سلیمانی

معمر شخص جس کا چہرہ، سر کے بال، جسم کی جلد بھنویں، لباس سبھی سفید تھے اور جس کی آنکھیں رات ڈھلے تک بھی بند نہیں ہوتی تھیں اور صبح وقت سے پہلے کھل جاتی تھیں، کی نظریں حسبِ معمول تصویرِ تختِ سلیمانی پر مرکوز تھیں۔

وہ تصویر سامنے کی دیوار پر عین دروازے کے اوپر آویزاں تھی۔ اس تصویر میں ایک سفید ریش بزرگ ہیرے اور موتیوں سے جڑا تاج پہنے ایک مزین تخت پر جلوہ افروز تھے۔

تخت کے پائے سفید پوش جنات اپنے شانوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ بزرگ کے سر پر پرندوں کا ایک غول اپنے اجلے پروں کا سایہ کیے ہوئے تھا۔ تخت کے آگے پیچھے چرند اور درند کھڑے تھے۔

اس کمرے میں ایک تصویر اور بھی تھی۔ وہ تخت والی تصویر کی عین سیدھ میں مخالف سمت کی دیوار پر ٹنگی تھی، اس تصویر میں ایک کبوتر اپنے پورے پورے پر کھولے نیلگوں فضا میں بلندی کی جانب پرواز بھر رہا تھا۔

معمر شخص کی پلنگ ایسی جگہ بچھائی گئی تھی جس کے سرہانے سے صرف دروازے کے اوپر والی تصویر ہی دکھائی دیتی تھی، کبوتر والی تصویر دیکھنے کے لیے اسے اپنی گردن ٹیڑھی کرنی پڑتی تھی۔ مگر باہر سے آنے والوں کی نظریں زیادہ تر کبوتر کی تصویر پر ہی پڑا کرتی تھیں

اورنظر پڑتے ہی ذہن میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ابھرتی تھی جو کبوتر کی کسی خصوصیت یا اس سے جڑی کسی کہانی کے متعلق ہوتی تھی۔

پلنگ کی چادر، کمرے کے فرش، چھت ، درودیوار اور دیواروں پر آویزاں پوٹریٹ کے رنگ بھی اس معمر شخص کے سراپے سے ہم آہنگ تھے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور معمر شخص کی نظریں تخت سے اتر کر پٹوں کی جانب مبذول ہوگئیں۔ بے وقت کی دستک سے اس کی پیشانی پر ویسی ہی سلوٹیں ابھر آئیں جیسی اس کے بستر کی سفید چادر پر ابھری پڑی تھیں۔

''آجاؤ!'' آواز کے ابھرتے ہی دروازے کے پٹ کھل گئے۔

ایک مخصوص قسم کے لباس میں ایک چاق وچوبند آدمی آہستہ روی سے اندر داخل ہوا۔ آگے بڑھ کر معمر شخص کے سامنے کمان کی طرح جھکا اور پھر تیر کی مانند تن گیا۔

''بولو''۔

''کچھ لوگ ملنا چاہتے ہیں حضور''

''اس وقت؟''

''کہتے ہیں کوئی اہم خبر ہے''

''کون لوگ ہیں؟''

''اپنے ہی لوگ لگتے ہیں''

''حلیہ کیسا ہے؟''

''بال لمبے ہیں، پیشانی پر لکیریں ابھری ہوئی ہیں، آنکھوں پر چشمے چڑھے ہوئے ہیں۔ دیکھنے میں بہت سنجیدہ ہیں۔ ان کا لب ولہجہ''۔۔۔۔۔''

''انھیں بٹھاؤ اور کہو کہ میرا انتظار کریں''۔

''بہتر حضور!''

معمر شخص کمرے سے ملحقہ ایک دوسرے کمرے میں داخل ہوا اور تھوڑی دیر بعد

لباس تبدیل کر کے واپس آ گیا۔ میز کے اوپر سے ایک خوبصورت سا بیگ اٹھایا اور کمرے سے نکل کر مہمان خانے میں پہنچ گیا۔

اسے دیکھتے ہی وہاں موجود لمبے بالوں اور موٹی موٹی عینکوں والے لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے لب کھلنے کے لیے بے تاب تھے مگر انھیں معمر شخص کے ہونٹوں کی جنبش کا انتظار تھا۔

''بتایئے کیا بات ہے؟'' معمر شخص نے ان سے تحکمانہ انداز میں پوچھا ''سر! پہلے تو ہم معذرت خواہ ہیں کہ ہم نے آپ کو بے وقت زحمت دی اور آپ کے آرام میں خلل پہنچایا۔ ان میں سے ایک جو سب سے آگے تھا بولنا شروع کیا۔ قدرے توقف کے بعد وہ پھر بولا مگر سر! ہم بھی مجبور تھے۔ خبر ہی ایسی ہے کہ آپ کو سنانا ضروری تھا۔''

معمر شخص کے چہرے کا اضطراب اور بڑھ گیا۔

''لیکن ہمیں یقین ہے سر کہ آپ خبر سننے کے بعد ہمیں ضرور معاف کر دیں گے۔''

''آپ بتائیں گے بھی یا۔—'' معمر شخص کا اضطراب بے قابو ہونے لگا۔

''سوری سر! خبر یہ ہے کہ ہم نے تقتنس بنا لیا ہے''—۔

''کیا'' معمر شخص کا مضطرب چہرہ اطمینان آمیز استعجاب سے بھر گیا۔

''جی سر! بالکل ویسا ہی بنا ہے جیسا کہ آپ نے خواب میں دیکھا تھا۔

''اچھا!'' استعجاب میں انبساط کی لے شامل ہو گئی۔

''جی ہاں سر''

''کیا اس کی منقار میں ۳۶۰ سوراخ بن گئے؟''

''جی بن گئے۔ بلکہ پانچ زیادہ بن گئے ہیں''۔

''سُر بھی سارے بھر گئے ہیں؟''

''جی''

''کوئی سُر چھوٹا تو نہیں؟''

''جی نہیں، کوئی بھی نہیں چھوٹا۔ بلکہ کچھ ایسے نئے سُر بھی ہم نے بھر دیے ہیں جنھیں کرۂ ارض پر ابھی تک سنا نہیں گیا''۔

''گڈ۔ کیا وہ دیپک راگ بھی نکال سکتا ہے؟''

''جی ہاں، دیپک راگ بھی نکال سکتا ہے''

''شعلے بھی نکلیں گے نا؟''

''جی شعلے بھی نکلیں گے''

''اور جنون؟''

''جنون بھی''

''جنون بھی!''

''جنون تو ایسا نکلے گا سر! کہ مجنوں بھی اس کے آگے مات کھا جائے۔ اسے دیکھ کر فرہاد کا تیشہ بھی ہاتھ سے چھوٹ جائے''۔

''خوب! بہت خوب!'' معمر شخص کسی تصور میں کھو گیا۔

''اس کی کچھ اور خوبیاں بھی ہیں سر''

''کیا کہا؟'' تصور سے باہر نکلتے ہوئے معمر شخص نے پوچھا۔

''سر یہی کہ اس میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں''

''مثلاً؟''

''مثلاً یہ کہ ہمارا تقنس اپنے سوراخوں سے محض سُر ہی نہیں نکالے گا، بلکہ وقت پڑنے پر ہمزاد بھی پیدا کر لے گا''۔

''تو کیا اسے اپنے اردگرد لکڑیاں جمع کرنے اور ان میں پھونک مارنے کی ضرورت نہیں پڑے گی؟''

''نہیں سر! ہمارا تقنس اپنے کو خاکستر کیے بغیر بھی اپنے اندر سے اپنے ہمزاد، وہ

بھی ایک نہیں، بے شمار پیدا کر سکتا ہے''

''واقعی آپ لوگوں نے کمال کر دیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں، مانگیے جو انعام مانگنا ہے''۔

''وقت آنے پر مانگ لیں گے سر! فی الحال ہمیں یہ حکم دیا جائے کہ ہمیں آگے کیا کرنا ہے؟''

''آپ اسے کسی سرسبز خطے میں اتار دیجیے''

''سرسبز خطے میں؟''

''آپ سے جتنا کہا جائے اتنا ہی کیجیے''، معمر شخص کی بھنویں تن گئیں۔

''سوری سر!'' خوشی سے انگارہ بنا چہرہ یکا یک راکھ ہو گیا۔

''کوئی بات نہیں، آئندہ احتیاط ضروری ہے''۔

''جی سر! سر اب اجازت؟''

''جایئے اور جو کہا گیا ہے اس کی تعمیل کیجیے''۔

''جی سر!''

حکم کی تعمیل میں قفنس کو ایک سرسبز و شاداب خطے میں اتار دیا گیا۔ زمین پر پاؤں رکھتے ہی اس کی منقار کھل گئی۔ منقار کے کچھ سوراخوں سے سُر نکلنے لگے۔

سُر سن کر اس خطے کے پرندے شاخوں اور آشیانوں کو چھوڑ کر اس کی جانب اڑان بھرنے لگے۔

پرندوں کے غول کے غول اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر قفنس فرطِ مسرت سے مست ہونے لگا۔ اس کی چونچ کے کچھ اور سوراخ بھی بولنے لگے۔

آہستہ آہستہ پرندوں کے آنے کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ اپنے اردگرد خوش رنگ پرندوں کو دیکھ کر قفنس کا جنون بھی انگڑائی لینے لگا۔ دیپک راگ بھی شروع ہو گیا۔

سوراخوں سے شعلے نکلنے لگے۔ آگ کی لپٹیں پیڑ پودوں، شاخوں، پتوں،

پھولوں اور پرندوں تک پہنچنے لگیں۔

رنگ اڑنے لگا۔ خوشبو بکھرنے لگی۔ زمزمے رکنے لگے۔ سناٹا طاری ہونے لگا۔ ویرانی چھانے لگی۔

فضا میں ہلچل مچ گئی۔ باغبان پریشان ہوا تھے۔ باغ کی حفاظت کی فکر ہوئی۔

خطے کے شکاریوں کو جمع کیا گیا۔ شکاریوں نے اس نئے قفنس کے شکار کی تدبیر شروع کر دیں۔ ایک سے ایک ترکیب عمل میں لائی گئی، مگر ساری ترکیبیں بے سود ثابت ہوئیں۔ کوئی بھی تدبیر کارگر نہ ہو سکی۔ کسی بھی طرح قفنس کے سُر نہیں رُکے۔

کسی سن رسیدہ اور جہاں دیدہ شخص نے بتایا کہ اس کائنات میں صرف ایک شکاری ایسا ہے جو اس قفنس کو قابو میں کر سکتا ہے۔ اس شکاری کا اتا پتا معلوم کرنے پر اس جہاں دیدہ آدمی نے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنے باؤ بھاؤ، رکھ رکھاؤ اور حلیے سے شکاری نہیں لگتا۔ اس لیے کہ وہ تمام شکاریوں سے مختلف ہے۔ وہ ایک خوبصورت ترین اور پر فضا علاقے میں شاندار طریقے سے رہتا ہے۔ اس تک رسائی آسان نہیں ہے مگر ناممکن بھی نہیں ہے۔

اس شخص کے بتائے گئے پتے پر پہنچ کر اس منفرد قسم کے شکاری تک رسائی حاصل کی گئی۔ اس کے آگے گڑگڑا کر دُکھڑا بیان کیا گیا اور اس بلائے ناگہانی سے نجات دلانے کی درخواست کی گئی۔

اس منفرد شکاری نے رحم دل حاکم کی طرح پوری روداد سنی اور فلسفیوں کی مانند کافی دیر تک اس پر غور و خوض کیا اور پھر اپنی کچھ شرطوں پر درخواست قبول کر لی۔

شرطیں پوری ہو جانے پر وہ اپنے بہت ہی ہشیار، یکتائے روزگار، اپنے فن میں مشاق اور جاں باز معاون شکاریوں کے ہمراہ اس خطے میں پہنچ گیا۔

حکمتِ عملی تیار ہوئی۔ گھیرا بندی کی گئی۔ چاروں طرف سے نشانے سادھے گئے۔ جگہ جگہ مضبوط جال بچھائے گئے۔ طرح طرح کے دانے پھینکے گئے۔ اِدھر اُدھر سے بندوقیں تانی گئیں۔ ان سب کے باوجود وہ قفنس قبضے میں نہ آ سکا۔

جب شکار کسی بھی طرح گرفتار نہ ہو سکا تو اس پر بلا بول دیا گیا۔

تلملا کر اس نے بھی اپنی پھونکیں تیز کر دیں۔ اس کا سینہ پھول کر دھونکنی ہو گیا۔ سوراخوں سے طرح طرح کے سُر نکلنے لگے۔

زیادہ ضرب پڑنے پر اس کا جنون بھی جوش میں آ گیا۔ سوراخوں سے دھڑا دھڑ اس کے ہمزاد نکلنے لگے۔ ان کی منقاریں بھی کھل گئیں۔

سُروں کے ساتھ دیپک راگ بھی گونجنے لگا۔ شعلے لپکنے لگے۔ شعلے شکاریوں کے بارودی گولوں سے ٹکرانے لگے۔ فضا میں چنگاریاں اڑنے لگیں۔ آگ کی لپٹیں پانیوں تک پہنچنے لگیں۔ جھیلیں اور ندیاں بھی جلنے لگیں۔ پانی بھاپ اور دھوئیں میں تبدیل ہونے لگا۔ ماحول میں دھند بھرنے لگی۔

دیر تک آگ کا کھیل چلتا رہا۔ سرسبز خطہ شعلوں میں جھلستا رہا۔

پھر اچانک سُر بند ہو گئے۔ دیپک راگ خاموش ہو گیا۔ شعلے بیٹھ گئے۔

چھان بین کرنے پر معلوم ہوا کہ ققنس مارا گیا۔ اس کے پر جھلس گئے۔ گوشت جل گیا، ہڈیاں راکھ ہو گئیں۔

ققنس کی موت کا پتہ چلتے ہی لبوں پر زمزمے سج گئے۔ فضائیں نقاروں کی آواز سے گونج اٹھیں۔ آسمان پر کبوتر اڑنے لگے۔

مگر زمین پر نظر گئی تو آنکھیں حیران ہوا ٹھیں۔ باغ پوری طرح اجڑ چکا تھا۔ سبزہ زار سیاہ پڑ گئے تھے۔ جھیلوں، نہروں، ندیوں اور تالاب سے شعلے نکل رہے تھے۔

خطے کی آبادکاری کی فکر لاحق ہوئی۔ بے بس اور ویران آنکھیں دوسرے خطوں کی طرف حسرت اور رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگیں۔

دوسرے خطوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل درد سے تڑپ اٹھا۔ ان خطوں نے اپنے در کھول دیے۔

ان کے باغوں سے پیڑ پودے اکھاڑ کر اس ویران خطے میں پہنچائے جانے

لگے۔ان کے تالابوں، جھیلوں، ندیوں اور نہروں سے نکل کر پانی کا ایک حصہ اس خطہ میں جانے لگا۔زمینیں سینچی جانے لگیں اور پودوں کے پنپنے، باغ کے ہرا بھرا ہونے اور پرندوں کے چہچہانے کا بے صبری سے انتظار کیا جانے لگا۔

اجڑا ہوا وہ خطہ ابھی پوری طرح آباد بھی نہیں ہو پایا تھا کہ ایک اور خطے میں ققنس کا سُر گونج اٹھا۔

عقل حیرت میں پڑ گئی کہ ققنس تو اپنے تمام ہمزادوں کے ہمراہ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔اب پھر سے وہ کیسے اور کس طرح پیدا ہو گیا؟

اس خطے میں بھی کھلبلی مچ گئی۔وہاں بھی وہی سب کچھ ہوا جو پہلے خطے میں ہوا تھا۔وہاں بھی اس منفرد شکاری سے رجوع کیا گیا۔اس بار وہ پہلے سے زیادہ تام جھام اور تیاری کے ساتھ پہنچا۔

ققنس پر پہلے سے زیادہ شدید حملہ ہوا۔اس حملے میں پہاڑ سرمہ بن گئے۔زمین راکھ ہو گئی۔ققنس کی راکھ تک نہیں بچی۔

ہر طرح سے اطمینان کر لینے اور مکمل یقین ہو جانے کے بعد وہاں بھی شادیانے بجے۔آسمان پر کبوتر چھوڑے گئے۔

جلد ہی آبادکاری کا کام بھی شروع کر دیا گیا۔کام ابھی چل ہی رہا تھا کہ ققنس کے سُر ایک اور خطہ سے جاگ اٹھا۔

عقل ایک بار پھر حیران ہوا ٹھی۔ذہن میں طرح طرح کے وسوسے سر اٹھانے لگے۔دور دور تک سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔تمام دنیا خوف و دہشت سے لرزنے لگی۔

ققنس کے جینے مرنے کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔خطے اجڑتے گئے۔کچھ خطے ان تاراج خطوں کو آباد کرنے میں اجڑنے لگے۔

مگر معمر شخص کے بستر کی سلوٹیں دور نہیں ہوئیں۔اس کی نظریں تختِ سلیمانی سے نیچے نہیں اتریں۔

دروازے پر ایک دن پھر دستک ہوئی۔ دروازہ کھلا، مخصوص لباس والا آدمی اندر داخل ہوا۔ آگے بڑھ کر جھکا اور جھک کر پھر کھڑا ہو گیا۔

''بولو''۔

''وہ لوگ آ گئے ہیں حضور جنھیں آپ نے طلب کیا تھا''۔

''انھیں بٹھاؤ میں ابھی آتا ہوں''

''بہتر حضور!''

معمر شخص مہمان خانے میں پہنچا تو اسے دیکھتے ہی لوگ اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''کیا حکم ہے سر؟'' ان میں سے ایک نے مئودبانہ سوال کیا۔

''آپ لوگ اپنی تخلیق کے کارنامے تو دیکھ رہے ہوں گے؟''

''جی سر! دیکھ رہے ہیں اور آپ سر؟'' اس کے چہرے پر چمک اور لہجے میں کھنک تھی۔

''ہم بھی دیکھ رہے ہیں''۔

''کیسا لگ رہا ہے سر؟''

''اچھا لگ رہا ہے پر''

''پر کیا سر؟''

''یہی کہ سفر طویل ہے اور رفتار سست''

''جی سر! یہ تو ہے''

''پھر؟''

''پھر کے متعلق تو آپ ہی کو فرمانا ہے سر''۔

''کوئی ایسی تخلیق پیش کیجیے جس میں کن فیکون کی سی تاثیر ہو''

''مگر یہ تاثیر تو.....''

''میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ جتنا کہا جائے.....''

''سوری سر'' وہاں کھڑے تمام لوگوں کے چہروں پر دہشت طاری ہوگئی۔

''آپ لوگ جاسکتے ہیں''۔ معمر شخص کے اضطراب کا پارہ کافی اوپر چڑھ گیا۔ اس کے چہرے کی سفید رنگت سرخ ہوگئی، جیسے برف کے تودے میں چنگاریاں بھر دی گئی ہوں۔

معمر شخص اپنے خواب گاہ میں آکر بستر پر دراز ہوگیا۔ سفید چادر اور سکڑ گئی۔ آنکھیں تخت سلیمانی کی جانب مرکوز ہوگئیں۔

تخت کے پایوں کو پکڑے ہوئے جن، تخت پر سوار نورانی چہرے والا تاج دار۔ تاج میں دمکتے ہوئے ہیرے موتی تاجدار کے سر پر پروں کو پھیلائے ہوئے پرند، تخت کے آگے پیچھے کھڑے چرند اور پرند پتلیوں میں سمانے لگے۔

وہ جب بھی اس کمرے میں آتا اور بستر پر دراز ہوتا تو اس پورٹریٹ کی ایک ایک تصویر اس کے دیدوں میں اترنے لگتی۔ اسے ماضی اور مستقبل میں دوڑانے لگتی۔ اسے بے چین کرنے لگتی۔ اس کے بستر پر سلوٹیں اور پیشانی پر لکیریں ابھارنے لگتی، مگر وہ تصویر اسے کبھی بھی دکھائی نہ دے سکی جو تخت سے باہر نکلے ہاتھ کی ہتھیلی کی چھاؤں کے نیچے جھلملا رہی تھی اور جہاں بے شمار بے زبان مخلوقات نقطوں اور چھوٹے چھوٹے دائروں کی شکل میں سکون پانے کے لیے سمٹ آئی تھیں اور جو شاید اسے بھی اضطراب کی حدت سے نجات دلا سکتی تھی۔

بالکونی میں کیکٹس

ٹھک ٹھک کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر نکل کر دیکھا تو سامنے والی کوٹھی کے ایک گنبد پر کچھ لوگ دھڑا دھڑ ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اچھی بھلی شاندار عمارت مسمار کیوں کی جا رہی ہے، البتہ اسے دیکھ کر ذہن میں ایک منظر ضرور ابھر آیا:

اس منظر میں بھی ایک گنبد پر ہتھوڑے برس رہے تھے۔ فرق اتنا تھا کہ منظر والے گنبد پر ایک ساتھ بے شمار ہتھوڑے پڑ رہے تھے اور یہاں محض دو چار۔

ذہن والا منظر جب رونما ہوا تھا تو اسے دیکھ کر کتنوں کے دیدے اشکوں سے بھر گئے تھے۔ میری آنکھیں بھی گیلی ہوگئی تھیں۔ اپنی آنکھوں کے گیلے پن پر جب میرا ذہن ٹھہرا تھا تو ایک اور منظر جو صدیوں پہلے کبھی وجود میں آیا تھا، میرے سامنے سمٹ آیا تھا۔ اس منظر میں بھی ایک عمارت ٹوٹ رہی تھی اور اسے بھی دیکھ کر بہتوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

ذہن کے دونوں منظروں کی عمارتوں کے انہدام کی وجہ تو سمجھ میں آ رہی تھی مگر سامنے والی عمارت کے ٹوٹنے کا سبب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

یہ دلآویز عمارت تو کسی کی آنکھوں کا کانٹا بھی نہیں تھی۔ یہ اپنے مکینوں کو تحفظ کے ساتھ ساتھ رنگ، خوشبو، روشنی، تازگی اور توانائی بھی بخش رہی تھی۔

ممکن ہے اس کوٹھی کی دیواریں کمزور پڑ گئی ہوں اور مکینوں کو کسی قسم کا خطرہ لاحق ہو گیا ہو۔

ذہن کے کسی گوشے سے یہ آواز ابھری۔

لگتا تو نہیں ہے کہ یہ کوٹھی کمزور پڑ گئی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو گنبد سے اس طرح کی لوہا لاٹ قسم کی آوازیں نہیں ابھرتیں۔

ذہن کے دوسرے گوشے نے پہلے گوشے کے شبہے کو دور کر دیا۔

تو ہو سکتا ہے اس کی بوسیدگی انھیں پریشان کرنے لگی ہو اور وہ قدیم عمارت کی جگہ کسی جدید طرز کی عمارت کا منصوبہ بنا رہے ہوں۔

یہ بات بھی مناسب نہیں لگتی کہ اس کوٹھی کے مکین روایتوں کے پاسدار ہیں اور اپنی وراثت کی حفاظت کے لیے کٹ مرنے والے لوگ ہیں۔

پھر کیوں ٹوٹ رہی ہے؟ اور ٹوٹ رہی ہے تو کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہو گی؟

ہو گی کوئی وجہ۔ مجھے کیا؟ میں نے اپنے اندر کے کسی گوشے سے اٹھتی ہوئی یہ آواز بھی سنی اس کے باوجود اس منہدم ہوتی ہوئی عمارت سے اپنے آپ کو الگ نہیں کر پایا۔ میری آنکھیں مسلسل گنبد پر جمی رہیں اور میرا دل ہتھوڑوں کی چوٹ پر لرزتا رہا۔

گنبد کی دیواریں کافی مضبوط تھیں۔ درجنوں بار ہتھوڑا برستا تھا تب جا کر کہیں کسی کونے کا تھوڑا سا حصہ ادھڑ پاتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اینٹ، پتھر اور سیمنٹ کے بجائے وہاں کسی دھات کی دیوار ڈھال دی گئی ہو۔ اس گنبد کی مضبوطی کا سبب صرف یہی نہیں تھا کہ اس کی تعمیر میں عمدہ سامان اور اچھے کاریگر استعمال ہوئے تھے بلکہ تعمیر کرنے والے کے ذوق وشوق کی گرمی، منصوبوں کی مضبوطی، ارادوں کی پختگی، خلوص کی صلابت اور نگرانی ونگہبانی کی مستعدی بھی اس میں شامل تھی۔

گنبد سے پھسل کر میری نگاہیں عمارت کے معائنے میں مصروف ہو گئیں:

کوٹھی ایک بہت بڑے رقبے میں بنائی گئی تھی۔ عمارت کے چاروں طرف اچھی

خاصی خالی جگہیں چھوڑی گئی تھیں۔ ان خالی جگہوں میں ایک طرف ایک باغ تھا جس میں سایہ دار پیڑوں کے علاوہ پھل دار درخت بھی تھے۔ کناروں پر اشوک اور سرو کے پیڑ کھڑے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ کوٹھی کے سامنے ایک بڑا سا لان تھا۔ لان میں مخملی سبزوں کا بچھونا بچھا ہوا تھا۔ ہرے بھرے بچھونے کے چاروں طرف کیاریوں میں رنگ برنگ کے پھول کھل رہے تھے۔ پھولوں کے پودے لان کے علاوہ کوٹھی کے دوسرے خالی حصّوں میں بھی جگہ جگہ لہلہا رہے تھے۔ ان پھولوں کی خوشبوئیں کوٹھی کے ماحول کو ہر وقت معطر رکھتی تھیں اور اپنے آس پاس کی فضا کو بھی مہکاتی رہتی تھیں۔ وہاں سے خوشبوئیں نکل کر ہمارے مکان میں بھی آتی تھیں۔ ہمارا مکان اس کوٹھی سے ملا ہوا تھا۔ اس کوٹھی اور ہمارے مکان کے درمیان صرف ایک باؤنڈری لگتی تھی۔ اسی باؤنڈری کے کنارے کنارے اس کوٹھی کے مالک اپنی مالکن کے ہمراہ روزانہ صبح و شام بلا ناغہ ٹہلا کرتے تھے اور ہمارے ٹیرس سے وہ ہمیں بہت قریب سے دکھائی دیتے تھے۔ نظر پڑنے پر اکثر ہم انھیں آداب بجالاتے تھے اور وہ بڑے شفیق اور نرم لہجے میں ہمارے آداب کے جواب میں ہمیں دعائیں دیتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہمارے اپنے بزرگ ہوں۔

میں دیر تک اس کوٹھی کو مختلف زاویوں سے دیکھتا رہا۔ میرا دماغ اس کے متعلق بہت کچھ سوچتا رہا اور میرا دل اس پر پڑنے والی ضرب کو سنتا اور سہتا رہا۔ پھر میں کسی ضروری کام سے باہر چلا گیا۔

شام کو لوٹا تو میری نظریں ایک بار پھر اس کوٹھی کی جانب مرکوز ہو گئیں۔

گنبد کا اوپری حصّہ ایک طرف سے ٹوٹ چکا تھا اور باقی حصہ جگہ جگہ سے دب گیا تھا، گول مٹول سڈول دکھائی دینے والا گنبد داغ دار ہوا پڑا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے گنبد کے چہرے پر ان گنت آنکھیں اور منہ ابھر آئے ہوں۔ ہر ایک آنکھ رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہو اور ہر ایک منہ مجھ سے فریاد کر رہا ہو۔ مجھ سے کہہ رہا ہو:

خدا کے لیے ہمیں بچالو۔ ان ہتھوڑوں کی ضرب کو روک دو۔ ہمارے مکینوں کو

سمجھاؤ۔ ان سے کہو کہ ہم نے ان کا کیا بگاڑا ہے کہ وہ ہمیں اس طرح بے دردی سے ڈھا رہے ہیں۔ ہمیں نیست و نابود کرنے پر تلے ہیں۔ انھیں بتاؤ کہ ہم تو ہمیشہ ہی ان کے کام آئے ہیں۔ ان کی کئی پشتوں کی حفاظت کی ہے۔ ان کی توقیر بڑھائی ہے۔ ان کے ناموں کو روشن کیا ہے۔ ان سے یہ بھی کہو کہ ہمیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ ہم اب بھی اسی طرح مضبوط ہیں اور ہماری وفاداری آج بھی قائم ہے اور ہم آئندہ بھی...

میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں بھیگی آنکھوں سے اس عمارت کو دیکھتا رہا۔ اس کے اندر سے نکلنے والی آواز کو سنتا رہا۔ شام گہری ہوتی گئی۔ آہستہ آہستہ کوٹھی دھند میں کھوتی چلی گئی۔

دن نکلتے ہی ٹھک ٹھک کا سلسلہ پھر سے شروع ہوگیا۔ گنبد پر صبح سے شام تک ہتھوڑے برستے رہے۔ نہایت مضبوط گنبد بھی ہتھوڑوں کی مسلسل چوٹ پر آہستہ آہستہ کمزور پڑتا گیا۔ اندر اور باہر دونوں طرف سے تھوڑا تھوڑا ٹوٹتا گیا اور ایک دن پوری طرح منہدم ہوگیا۔

ایک گنبد کے بعد دوسرے گنبد کے انہدام کا کام شروع ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے گنبد کا کام بھی تمام ہوگیا۔ کچھ دنوں میں کوٹھی کے سارے گنبد ڈھہ گئے۔ سرفرازی عطا کرنے والے نشانوں سے کوٹھی پوری طرح خالی ہوگئی۔ بے گنبد کی کوٹھی بد ہیئت، بے رونق اور بے وقار سی لگنے لگی۔

گنبدوں کے بعد چھتوں کا نمبر آگیا۔ چھتیں بھی بڑی شکل سے ٹوٹ پائیں۔

چھتوں کے بعد دیواریں گرنے لگیں اور ایک ایک کر کے ساری دیواریں بھی زمیں بوس ہوگئیں۔ کوٹھی ملبے میں تبدیل ہوگئی۔ ملبے کے آس پاس بلڈوزر آگئے اور آناً فاناً میں کوٹھی کا سارا ملبہ بھی سرک گیا۔

کوٹھی کے گرنے اور ملبوں کے ہٹنے کے بعد کیمپس میں کھڑے پیڑ بھی کٹنے لگے۔ دوسروں کو سایہ دینے والے درخت خود اپنے وجود سے بھی محروم ہوتے چلے گئے۔

پھولوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ کچھ پھول زمین کی کھدائی کی نذر ہو گئے۔ کچھ پر مٹی پڑ گئی اور جو باقی بچے وہ اینٹ، بجری، بالو اور سریا کے ڈھیروں کے نیچے دب کر اینٹھ گئے۔

رنگ اڑ گئے، خوشبوئیں مٹی میں مل گئیں۔

میری آنکھیں گنبدوں کے ٹوٹنے سے لے کر دیواروں کے گرنے تک اس کوٹھی کے مکینوں کی متلاشی رہیں۔ وہاں آنے جانے والے لوگوں میں وہ چہرے تلاش کرتی رہیں جو کبھی اس کوٹھی میں رات دن دکھائی دیا کرتے تھے۔ شاید میری آنکھیں یہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ اس انہدام کا ان پر کیا اثر ہوا مگر آخر تک ان میں سے کوئی بھی چہرہ دکھائی نہیں دیا۔

کچھ دنوں بعد وہاں ایک بہت بڑا اپارٹمنٹ بن کر تیار ہو گیا۔ ایک ایک کر کے لوگ فلیٹوں میں آنا بھی شروع ہو گئے۔ وہ مقام جو نہایت پرسکون رہا کرتا تھا، شور اور ہنگاموں سے بھر گیا۔ صبح و شام گاڑیاں دندنانے لگیں۔ ان سے نکلنے والی طرح طرح کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اِدھر اُدھر سے دھواں اٹھنے لگا۔ فضا میں پیٹرول اور ڈیزل کی بو بسنے لگی۔ کمروں سے ویسٹرن میوزک کی فلک شگاف صدائیں چیخنے لگیں۔

ایک دن ہمارے مکان کے سامنے والے فلیٹ کی بالکونی میں بیٹھے مجھے دو بزرگ نظر آئے۔ غور سے دیکھا تو وہ کوٹھی کے مالک اور مالکن تھے جو اس وقت کوٹھی کے زمانے میں باؤنڈری کے کنارے کنارے ہوا خوری کرتے نظر آتے تھے۔

دونوں کی نظریں بالکونی کے کناروں پر رکھے گملوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ کچھ گملوں میں کیکٹس تھے اور کچھ میں وہ پھول جو کبھی کوٹھی کے لان میں کھلے نظر آتے تھے۔ کوٹھی کے لان میں ہر وقت کھلے رہنے والے پھول مرجھائے پڑے تھے۔

اچانک میری نگاہیں پھولوں سے ہٹ کر بالکونی کی لمبائی چوڑائی ناپنے میں مصروف ہو گئیں:

بالکونی کوئی دس بارہ فٹ لمبی اور تین یا چار فٹ چوڑی ہو گی۔ بالکونی کے سائز سے اندازہ ہوا کہ فلیٹ کے کمرے دس بائی بارہ (12×10) یا بارہ بائی چودہ (14×12)

کے ہوں گے۔ ادھر ادھر دیکھنے پر یہ بھی اندازہ ہوا کہ اس فلیٹ میں دو یا تین بیڈروم ہوں گے۔ ان کے علاوہ ایک ڈرائنگ روم ہوگا۔ ایک لابی ہوگی۔ ایک کچن ہوگا اور دو یا تین باتھ روم ہوں گے۔ یعنی فلیٹ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو گز میں بنا ہوگا۔

اچانک کوٹھی کی باہری بیٹھک جس میں عام لوگوں کو بٹھایا جاتا تھا، میری آنکھوں میں ابھر آئی۔ اس بیٹھک کی لمبائی چوڑائی اس پورے فلیٹ کے رقبے سے زیادہ ہی ہوگی۔ خاص لوگوں والی بیٹھک تو اس سے بھی بڑی تھی جس میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بہترین قسم کے صوفے بچھے رہتے تھے۔ فرش پر ایرانی قالین جگمگا تا رہتا تھا اور دیواروں پر شیر، چیتے، ہرن وغیرہ کی کھالیں لٹک رہی ہوتی تھیں۔ وہ سارے صوفے تو اس فلیٹ میں آنہیں پائے ہوں گے؟ کیا کیا ہوگا ان کا؟ کیا پتہ وہ بھی ٹوٹ گئے ہوں یا...

کوٹھی کی بیٹھک آنکھوں سے نکل گئی۔ نگاہیں پھر سے بالکونی میں بیٹھے ان بزرگوں پر مرکوز ہوگئیں۔ وہ جن کرسیوں پر بیٹھے تھے وہ وہ نہیں تھیں جن پر وہ اکثر اپنے لان کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ وہ تو ایزی چیئر ہوا کرتی تھیں جو آگے پیچھے دور تک پھیلی ہوئی ہوتی تھیں۔ وہ کرسیاں تو اس بالکونی میں بچھ بھی نہیں سکتی تھیں۔

ان کی نظریں اب بھی ان گملوں پر مرکوز تھیں۔

کچھ دنوں بعد میں نے دیکھا کہ بالکونی کے گملوں کے وہ پھول جو کوٹھی کے لان کے پھولوں کی طرح لگتے تھے، غائب ہوگئے تھے اور ان کی جگہ پر بھی کیکٹس آگئے تھے۔ شاید اصلی زمین پر پروان چڑھنے والے پودے گملوں کی مصنوعی زمین میں پنپ نہیں پائے تھے۔

صبح کے وقت وہ دونوں بزرگ اکثر مجھے بالکونی میں بیٹھے نظر آتے تھے۔ جب سے وہ فلیٹ میں آئے تھے ان کی صبح کی سیر بند ہوگئی تھی یا انھوں نے اپنی سیر کا وقت تبدیل کرلیا تھا۔ بالکونی میں بیٹھے یا تو وہ گملوں کو تاکا کرتے تھے یا باؤنڈری سے لگی زمین کی سمت اپنی نظریں جمائے رہتے تھے جو کبھی نو دس فٹ کی فٹ پاتھ ہوا کرتی تھی اور اب سکڑ کر دو

ڈھائی فٹ کی گلی بن گئی تھی۔

اکثر میرے جی میں آتا کہ میں ان سے پوچھوں کہ انھوں نے یہ کیا کیا؟ کیوں کیا؟ پھر ایک دن مجھے خود ہی جواب مل گیا۔ معلوم ہوا کہ پورے جاپلنگ روڈ کا یہی حال ہوا پڑا ہے۔ زیادہ تر کوٹھیاں ٹوٹ چکی ہیں اور ان کی زمینوں میں اپارٹمنٹ بن گئے ہیں اور جو بچ گئی ہیں انھیں توڑنے کی تیاریاں چل رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی وبا پھیلی ہوئی ہو۔ سچ مچ وبا ہی تھی۔ اس وبا کے جراثیم بہت پہلے ان کوٹھیوں میں چھوڑ دیے گئے تھے جنھوں نے اندر ہی اندر انھیں اور ان کے مکینوں کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا تھا اور ان کے گوشت پوست کو چاٹ کر انھیں ڈھانچا بنا دیا تھا اور ڈھانچے کو تو ایک دن گرنا ہی تھا۔

آہستہ آہستہ میں اس کوٹھی کو بھول گیا مگر ایک دن ابا میرے کمرے میں آئے اور بولے ''ہم بھی اپنے مکان کو توڑ کر فلیٹ بنا دیں تو کیسا رہیگا؟''

یہ سنتے ہی کوٹھی پھر سے میرے ذہن میں کھڑی ہوگئی۔ ہتھوڑے برسنے لگے۔ گنبد چٹخنے لگے۔ پلستر ادھڑنے لگا۔ دیواریں چٹخنے لگیں۔ کوٹھی باہر اندر دونوں جانب سے ٹوٹنے لگی۔

میں کچھ بولے بغیر ابا کو ہکا بکا ہو کر دیکھنے لگا۔

''تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟ کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟'' میری حیرت پر ابا بھی حیران ہوا تھے۔

''ابا! ایسا اگر میں سوچتا تو شاید حق بجانب بھی ہوتا مگر آپ سوچ رہے ہیں اس لیے حیرت تو ہوگی ہی۔''

''کیوں، مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے؟'' ابا کی نظریں مجھ سے جواب چاہنے لگیں۔

''ابا! کیا آپ کو اس مکان میں کوئی تکلیف ہے؟''

''نہیں تو، مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

ابا کا جواب سن کر مجھے اطمینان ہوا کہ کوٹھی والے جراثیم ہمارے مکان میں داخل نہیں ہوئے ہیں اور وہ داخل ہو بھی کیسے سکتے ہیں، ہمارے پاس مکان ہے، کوٹھی تھوڑے ہی ہے۔

''تم نے جواب نہیں دیا۔'' ابا مجھے بے چین سے نظر آنے لگے۔

''اس لیے کہ آپ کے ذہن میں فلیٹ کا یہ منصوبہ جو آیا۔''

''کیا بغیر کسی تکلیف یا پریشانی کے یہ منصوبہ ذہن میں نہیں آسکتا؟''

''آپ کے ذہن میں تو نہیں آنا چاہیے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ آپ پرانی قدروں کے پاسدار ہیں۔ اپنی روایات آپ کو عزیز ہیں۔ اپنے ورثے سے جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں آپ۔ آپ لوگوں کی سوچ نئی نسلی کی طرح نہیں ہوتی۔''

''کیا ہم یہ نہیں سوچ سکتے کہ ہماری اولاد متمول ہو۔ اس کے پاس عیش و آرام کے سامان ہوں۔ وہ خوشحال زندگی بسر کرے۔ تنگ دستی کے احساس سے وہ دوچار نہ ہو۔

''ایسا ضرور سوچ سکتے ہیں اور سوچنا بھی چاہیے مگر اس کے لیے اس طرح کا منصوبہ باندھنا مناسب نہیں ہے۔ ہمارا تو اس مکان سے رشتہ اتنا گہرا نہیں ہے مگر آپ کا تو...''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میری بات سن کر ابا دیر تک خاموش رہے۔ پھر کھنکار کر بولے ''میں سمجھ گیا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو اور تم اپنی جگہ حق بجانب بھی ہو مگر اس پہلو پر ذرا اس زاویے سے بھی تو سوچ کر دیکھو کہ ہمارے ایسا کرنے سے کئی بے گھر لوگوں کو بھی گھر مل سکتا ہے۔ ہماری بدولت دوسروں کو بھی چھت نصیب ہو سکتی ہے اور ایک جگہ پر جہاں صرف ایک کنبہ آباد ہے، وہاں کئی خاندان بس سکتے ہیں''۔

میری نظریں ایک بار پھر سے ابا کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

''تم پھر سے مجھے گھورنے لگے۔ کیا میرا ایسا سوچنا غلط ہے؟''

''نہیں، ایسا سوچنا بالکل غلط نہیں ہے۔ بیشک سوچنے کا یہ بھی ایک زاویہ ہے اور بلاشبہ یہ ایک مثبت زاویہ ہے مگر سچ بتایئے گا ابا! کیا آپ ایسا سوچتے ہیں؟ کیا واقعی آپ یہ منصوبہ اس لیے باندھ رہے ہیں کہ کچھ لوگوں کو آپ کے اس منصوبے سے گھر مل جائے گا؟''

ابا خاموش ہو گئے اور اس بار اس طرح خاموش ہوئے جیسے ان کی کوئی چوری پکڑ لی گئی ہو۔

''ابا، آپ کی خاموشی بتا رہی ہے کہ آپ ایسا نہیں سوچتے۔ آپ کیا، کوئی بھی ایسا نہیں سوچتا۔''

''مانا کہ میں ایسا نہیں سوچتا مگر بیٹے! ذرا اس پہلو پر بھی تو غور کرو کہ یہ منصوبہ میرے ذہن میں کیوں آیا؟ روایتوں کی پاسداری کرنے والا ایک بوڑھا شخص کیوں ایسا سوچنے پر مجبور ہوا؟ بیٹے! بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کہی نہیں جاتیں۔ کاش تم...''

ابا کچھ اور کہتے کہتے رک گئے۔

ابا اور کیا کہنا چاہتے تھے؟ ان کا اشارہ کن باتوں کی طرف تھا؟ ان کہی باتیں کیا ہو سکتی ہیں؟

میرا ذہن ادھر ادھر دوڑنے لگا۔

''ٹھیک ہے، تمھاری مرضی نہیں ہے تو یہ کام نہیں ہوگا۔ چلتا ہوں۔

ابا چھڑی کے سہارے اٹھ کر جانے لگے۔''

''کیسے نہیں ہوگا؟'' یہ میرے چھوٹے بھائی کی آواز تھی۔ شاید وہ دروازے کی اوٹ سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ وہ دروازے کے پاس سے کمرے میں آ گیا۔ ابا کے پاؤں رک گئے۔

''کیا بات ہے، تم اتنے طیش میں کیوں ہو اشفاق؟''

''طیش میں آنے کی بات ہی ہے بھیا! ابا اتنا اچھا پروپوزل آپ کے پاس لے

کرآئے اور آپ نے اسے Reject کر دیا۔"

"اپنے بزرگوں کی امانت میں خیانت کرنا اور اپنی وراثت کو اجاڑنا کیا یہ اچھا پروپوزل ہے؟ اور اتنے بڑے اور کشادہ مکان کو ختم کر کے فلیٹ کو ترجیح دینا یہ کہاں کی عقلمندی ہے؟"

"تو کیا یہ عقلمندی ہے کہ ہم ایک سڑے گلے سیلن زدہ مکان میں اپنی پوری زندگی گزار دیں"۔

"میری نگاہیں حیرت اور غصے سے اشفاق کو دیکھنے لگیں۔"

"بھیا! میں جانتا ہوں کہ میرا جواب آپ کو اچھا نہیں لگا اور میرا لہجہ بھی آپ کو ناگوار محسوس ہوا مگر حقیقت یہی ہے کہ آپ جس مکان کو بڑا سمجھ رہے ہیں وہ آج کے تناظر میں کافی چھوٹا ہو چکا ہے۔ آپ کو اس کی کشادگی تو نظر آتی ہے مگر اس کی تنگی محسوس نہیں ہوتی۔ پتہ نہیں آپ کیسے فن کار ہیں کہ ساری دنیا کا دکھ درد تو آپ کو نظر آتا ہے مگر اپنے گھر کا کرب کبھی محسوس نہیں ہوتا۔ بھیا! آپ جس مکان کا قصیدہ پڑھ رہے ہیں کبھی آپ نے اس پر غور کیا ہے کہ جب ہمارے بچوں کے دوست ہماری بیٹھک میں بیٹھتے ہیں اور ان کی نظریں ہمارے ادھڑے ہوئے فرش کو کریدتی ہیں تو اس وقت ہمارے بچوں کے دلوں میں کیسی کیسی چبھن ہوتی ہے؟ وہ اپنے اندر کیا کیا ٹوٹتا ہوا محسوس کرتے ہیں؟، بھیا! کبھی آپ نے بھابی جان کی خاموشی پڑھنے کی کوشش کی ہے کہ اس میں کیا کیا چھپا ہے؟ کیسی کیسی چیخیں پنہاں ہیں؟ بچوں سے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ وہ اس مکان میں کیسا محسوس کرتے ہیں؟ انھیں کس طرح کی زندگی چاہیے؟ کھانے پینے کے علاوہ انھیں اور کیا کیا چاہیے؟ آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارے بچے یہاں مطمئن ہیں۔ وہ اس زندگی سے خوش ہیں مگر آپ کی یہ خوش فہمی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ اپنی موجودہ طرزِ زندگی سے دکھی ہیں۔ اوبے ہوئے ہیں مگر وہ ہمارے ڈر سے اپنے کرب کا اظہار نہیں کرتے۔ یا ہمارے گھر کا سنسکار ان کا منہ بند رکھتا ہے۔ بھیا! سچ یہ ہے کہ ہمارا مکان بوسیدہ اور بیکار ہو چکا ہے۔ اس کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اس بوسیدہ اور پرانے مکان کے لیے اتنا فکر مند کیوں ہیں؟"

اشفاق نہ جانے کب سے بھرا بیٹھا تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں اپنی ساری بھڑاس نکال لی۔

''اشفاق ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ ہمارا یہ مکان کافی بوسیدہ ہو چکا ہے۔ اتنا بوسیدہ کہ جگہ جگہ دیواروں پر پپڑیاں نکل آئی ہیں۔ پلستر جھڑ رہا ہے۔ بعض کمروں کا فرش بھی چٹخ گیا ہے۔ کئی جگہوں سے تو بیٹھ بھی گیا ہے۔ پھر اتنے لمبے چوڑے کمرے ہیں کہ جھاڑو دیتے وقت گھر کی عورتوں کی سانسیں اکھڑ جاتی ہیں۔ صحن اتنا لمبا ہے کہ ٹھیک سے صاف نہیں ہو پاتا۔ کسی نہ کسی گوشے میں کوڑا رہ ہی جاتا ہے۔ چھتوں کا حال بھی برا ہے۔ ہمارا یہ مکان بالکل ضعیف اور بیمار ہو چکا ہے اشتیاق! ہمارے خیال سے تو اسے...''

میری آنکھیں ابا کے سراپے کو گھورنے لگیں۔

ابا کا سر بالوں سے لگ بھگ خالی ہو چکا تھا۔ پیشانی پر جھرّیوں کا جال بچھ گیا تھا۔ آنکھیں اندر تک دھنس گئی تھیں۔ کنپٹیوں کے دونوں کناروں پر گڈھے بن گئے تھے۔ سینے کی پسلیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں کی کھال ہڈیوں سے الگ ہو کر لٹک گئی تھی۔ کمر جھک گئی تھی۔ ہاتھ میں ہر وقت عصا رہنے لگی تھی۔ یہ وہ چھڑی نہیں تھی جسے وہ اپنی ماسٹری کے دور میں اسکول لے جایا کرتے تھے اور اس سے شریر اور کند ذہن بچوں کی چمڑی ادھیڑا کرتے تھے اور راستے میں بھونکنے والے کتوں کی پیٹھ پر بجایا کرتے تھے بلکہ یہ وہ چھڑی تھی جو اب ان کے بڑھاپے کا سہارا بنی ہوئی تھی۔ اٹھنے بیٹھنے میں ان کی مدد کرتی تھی۔ ان کی لڑکھڑاہٹ کم کرتی تھی۔ انھیں گرنے سے بچاتی تھی۔ ابا کے چہرے کا رنگ اب ویسا نہیں رہ گیا تھا جو ان کی تعلیم کے دور تک برقرار تھا۔ دیدے ویران اور سنسان ہو گئے تھے۔

میرے جی میں آیا کہ میں ابا سے یہ سوال پوچھوں کہ جو ضعیف اور پرانا ہو جاتا ہے کیا اسے ختم کر دیا جاتا ہے کہ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے پیچھے سے میرے سر پر چپت لگائی ہو۔ میں نے دل ہی دل میں توبہ استغفار کیا اور ابا سے مخاطب ہوتا ہوا بولا:

''ٹھیک ہے ابا! جب آپ سب نے من بنا ہی لیا ہے تو میں بھلا اکیلا آپ لوگوں

کو کیسے روک سکتا ہوں۔"

"اشتیاق بیٹے! اس میں ناراض ہونے کی بات نہیں ہے۔ ہم کبھی نہیں چاہیں گے کہ گھر میں بغیر تمھاری مرضی کے کوئی کام ہو۔ میری تم سے التجا ہے کہ اس مسئلے پر ایک بار پھر سے سوچو اور سوچتے وقت ان باتوں پر بھی دھیان دو جنھیں ہم زبان پر نہیں لا پاتے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

"بھیا! میں بھی چلتا ہوں۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہوگئی ہو تو معاف کر دیجیے گا۔ میری نیت آپ کا دل دکھانا ہرگز نہیں تھی۔

ابا اور میرا چھوٹا بھائی دونوں چلے گئے۔ میں کمرے میں اکیلا رہ گیا مگر ان کے جاتے ہی میرے سامنے منظروں اور آوازوں کا ریلا لگ گیا۔

آہستہ آہستہ میرے مکان کا رقبہ سکڑنے لگا۔ فرش سمٹنے لگا۔ دیواریں بیٹھنے لگیں۔ چھتیں نیچے آ گئیں۔ لمبا چوڑا مکان چھوٹا ہو گیا۔ جیسے ہمارا قد کسی جادوئی شیشہ گھر کے شیشے کے سامنے بونا ہو جاتا ہے۔

اچانک پڑوسی کی وہ کوٹھی بھی کھڑی ہوگئی جو منہدم ہو چکی تھی۔ اس کا گیٹ کھلا، کوٹھی کا اندرونی حصہ سامنے آ گیا۔ میری آنکھوں کے شیشے میں وہ بھی ویسا ہی نظر آنے لگا جیسا کہ میرا مکان مجھے دکھائی دے رہا تھا۔

اشفاق اور ابا کے منصوبے کی پھونک سے میرے اندر کی بھڑکی ہوئی آگ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

ہم اپنے مکان سے نکل کر عارضی طور پر کسی کرائے کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ ہمارے مکان پر بھی ہتھوڑے برسنے لگے۔ اس کی بھی چھت ادھڑنے لگی۔ اس کی دیواریں بھی ٹوٹنے لگیں۔ اس سے بھی ٹھک ٹھک کی آوازیں ابھرنے لگیں مگر میں ان آوازوں کو نہیں سن سکا۔ میرے دل پر کوئی چوٹ بھی محسوس نہیں ہوئی جیسے میرے دل اور سماعت دونوں کو سن کر دیا گیا ہو۔

ایک اور منتھن

آواز نے سب کو چونکا دیا۔ متحرک پاؤں ٹھٹھک گئے۔ مصروف ہاتھ رُک گئے۔ کان اعلان سننے کے لیے بے قرار ہوا ٹھے۔

''بھائیو اور بہنو! بزرگو اور بچو! آج رات کلا بھون میں دیش کی مشہور ناٹک منڈلی ''سنسکرتی'' اپنا ایک ناٹک ''ساگر منتھن'' پرستوت کرے گی۔ اس کھیل میں منجھے ہوئے کلا کار اپنی بے مثال کلا کا کمال دکھائیں گے۔ آج کا یہ رومانچک کھیل آپ دیکھنا نہ بھولیں۔ خود آئیں اور اپنے ملنے والوں کو بھی ساتھ لائیں۔''

ناٹک کا مژدہ سن کر لوگوں کے دلوں میں ترنگ بھر گئی۔ ٹھہرے ہوئے ہاتھ پاؤں دوبارہ حرکت میں آ گئے۔ بند پڑے کام تیزی سے نمٹنے لگے۔ آنکھیں روشنی کے جانے اور تاریکی کے آنے کی دعائیں مانگنے لگیں۔

دن ڈھلتے ہی کلا بھون کے پنڈال میں لوگوں کا ہجوم لگ گیا۔ نگاہیں پردے کے پیچھے کے منظر کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گئیں۔ تجسس انتہا کو پہنچنے لگا۔

پردہ اٹھ گیا۔

منظر اپنے ایک ایک خط و خال کے ساتھ آنکھوں میں بسنے لگا۔ اسٹیج کے درمیانی حصے میں بنا مصنوعی سمندر، سمندر کے وسط میں گھومتا ہوا اسٹیل کا ایک گول مٹول کھمبا، کھمبے سے لپٹی ہوئی پلاسٹک کی موٹی رسّی، رسّی کے دونوں سروں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر اپنی

طرف کھینچتے ہوئے بہت سارے لوگ۔

ایک طرف کے لوگوں کا تین چوتھائی جسم کپڑوں سے خالی، سر پر روکھے پھیکے بے ہنگم بال، چہرے کا جھلسا ہوا رنگ، دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، ہونٹوں پر پپڑیاں، چھاتی کی جھانکتی ہوئی پسلیاں، ننگے پاؤں، پنڈلیوں اور ہاتھوں پر کن کھجوروں کی طرح ابھری ہوئی رگیں۔

دوسری جانب کے لوگوں کا بدن سر سے پاؤں تک گھٹا ہوا۔ سڈول ہاتھ پاؤں، بھرے ہوئے گال چمک دار چہرے، روشن آنکھیں۔

دونوں طرف کی نگاہیں سمندر پر مرکوز مسلسل گھومتے ہوئے کھمبے کے پاس سے نکلتا ہوا ایک خاص طرح کا شور، سطح سے اٹھتا ہوا جھاگ۔

اسٹیج کے ایک حصے میں کرسیوں پر عمدہ لباس زیب تن کیے ہوئے کچھ معمر اور سنجیدہ افراد ایک گوشے میں کچھ بڑے چھوٹے برتن، رسیوں کا گٹھر وغیرہ۔

کرسیوں پر براجمان افراد میں سے ایک شخص کھڑا ہوا۔

''دیویو تتھا بجنو! ساگر منتھن شروع ہو چکا ہے۔ دھیان سے دیکھیے اور پرارتھنا کیجیے کہ سمندر کے گربھ سے وہ سب کچھ باہر نکل آئے جس کی ہمیں آوشیکتا ہے اور ہمارا اُدشیہ ایک ایک منشیہ تک پہنچ جائے جس کے لیے یہ رچنا رچی گئی ہے۔ دھنیہ واد۔''

مجمعے کی آنکھیں اسٹیج پر مرکوز ہو گئیں۔ کچھ گوشوں میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔

کرسی سے تھوڑی دیر بعد ایک دوسرا آدمی کھڑا ہوا۔

''ہمارے پیارے تماش بین! آپ کی بد بداہٹیں اور آنکھوں کی پتلیوں کی گردشیں یہ بتا رہی ہیں کہ آپ کچھ حیران ہیں۔ آپ کی حیرانی کی وجہ شاید یہ ہے کہ آپ ساگر منتھن کے قصے سے پرچت ہیں۔ آپ کے من میں یہ پرشن اٹھ رہے ہوں گے کہ آج کے منتھن میں دیونا اور دانوں کی جگہ مانو، پربت کے استھان پر اسٹیل کا کھمبا، اور ناگ واسو کی کی جگہ پلاسٹک کی رسی کیوں؟ آپ کے یہ پرشن سبھاوک ہیں لیکن آپ دھیرج رکھیے۔

نانک کا انت آتے آتے آپ کے ان تمام سوالوں کے جواب اوشیہ مل جائیں گے۔''

سرگوشیاں رک گئیں۔ لوگوں کی نظریں سمندر کی سطح پر مرکوز ہوگئیں۔ البتہ کچھ نظریں اب بھی اسٹیج پر گردش کرتی رہیں۔

''دیکھو! دیکھو! کچھ نکل آیا۔'' اسٹیج پر بیٹھے کسی کے منہ سے یہ آواز نکلی۔ یک بارگی منتھن رک گیا۔ رسّی کھینچنے والوں کی نگاہیں سطحِ آب کا جائزہ لینے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔ پیشانی پر نور جھلملانے لگا۔

اسٹیج پر بیٹھے کچھ لوگ اپنی جگہ سے اُٹھ کر سمندر کے پاس پہنچے اور گربھ سے نکلے پدارتھ کو پانی سے نکال کر ایک بڑے برتن میں رکھ دیا۔

''کیا نکلا صاحب؟'' تین چوتھائی عریاں جسموں والے لوگوں کی جانب سے سوال کیا گیا۔ کرسی پر بیٹھے معمر اشخاص میں سے ایک فرد کھڑا ہوا۔

''آپ کا سوال بالکل فطری ہے۔ آپ کی محنت سے جو رتن نکلا ہے اس کے بارے میں آپ کو جاننے کا پورا پورا ادھیکار ہے پرنتو بنا جانچ پرکھے یہ بتانا سمبھو نہیں ہے کہ ابھی ابھی سمندر کے گربھ سے جو رتن نکلا ہے وہ کیا ہے؟ اس کے لیے ابھی آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔''

منتھن پھر سے جاری ہوگیا۔ رکے ہوئے ہاتھ رسی کھینچنے میں مصروف ہوگئے۔ ہاتھوں کی رگیں پھولنے لگیں۔ جسم سے پسینہ بہنے لگا۔ آنکھیں کسی اور رتن کے انتظار میں سمندر کی سطح پر مرکوز ہوگئیں۔

تین چوتھائی ننگے بدن والے لوگوں کی صف کا ایک آدمی اچانک لڑکھڑانے لگا۔

''کیا کر رہے ہو، ٹھیک سے رسی کھینچو انیتھا سنتولن بگڑ جائے گا۔'' کرسی پر بیٹھے اشخاص میں سے ایک نے قدرے سخت لہجے میں ٹوکا۔

''کم زوری سے چکّر آ گیا صاحب! اس لیے...'' اس کی زبان بند ہوگئی۔ ضعف کے سبب وہ جملہ پورا نہ کر سکا۔

''یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم اب کام کے لائق نہیں رہے، نہیں کھینچا جا رہا ہے تو ادھر جا کر بیٹھ جاؤ۔''

''اچھا صاحب!'' یہ کہہ کر وہ صف سے نکل کر کنارے جا کر بیٹھ گیا اور اس کی جگہ اسی کے قبیلے کا ایک آدمی آ کر رسّی کھینچنے میں مصروف ہو گیا۔

''پھر کچھ نکلا۔'' شور بلند ہوا۔

یک بارگی رسّی کھینچنے والوں کے ہاتھ رک گئے۔ نگاہیں سطحِ آب پر مرکوز ہو گئیں۔ حسبِ معمول کچھ لوگ کرسیوں سے اٹھ کر پانی کے پاس پہنچے اور تہہ سے سطح پر آئے پدارتھ کو نکال کر ایک برتن میں رکھ دیا۔

منتھن پھر سے جاری ہو گیا۔ رکے ہوئے ہاتھ پھر سے رسّی کھینچنے میں مصروف ہو گئے۔ ہاتھوں کی رگیں تننے لگیں۔ جسم سے پسینہ بہنے لگا۔ آنکھیں کسی اور رتن کا بے صبری سے انتظار کرنے لگیں۔

''کیا نکلا ہوگا؟'' تماشائیوں کے ایک گوشے میں ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

''پہلی بار تو کوئی نیلے رنگ کا بدارتھ نظر آیا تھا۔''

''اور اس بار؟''

''اس بار ٹھیک سے دھیان نہ دے سکا۔''

''پہلا والا وِش تو نہیں تھا؟''

''ہو سکتا ہے۔''

''اور دوسرا والا امرت ہو؟''

''سمجھو ہے۔''

''یار انھیں بتانا چاہیے۔''

''بتائیں گے۔''

''کب؟''

''جب منتھن پورا ہو جائے گا۔''

''یار! انھیں بتاتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیے''۔

''پھر کھیل میں ہماری دل چسپی کیسے قائم رہے گی؟''

''ہاں، یہ بات بھی صحیح ہے''۔

کچھ دیر بعد رسی کھینچنے والے ہاتھ پھر رک گئے۔ نگاہیں سمندر سے نکلے پدا تھ پر مرکوز ہو گئیں۔ کچھ لوگ آگے بڑھے۔ سطح سے رتن کو نکال کر ایک تیسرے برتن میں رکھ دیا گیا۔

رسّی کھینچنے کا عمل جاری رہا مگر اس بار کافی دیر بعد بھی کچھ نہیں نکلا۔ رسّی کھینچنے والوں کی پریشانی بڑھ گئی۔ کم زور جسم لڑکھڑا کر زمین پر گرنے لگے۔

''دیکھیے، ہمّت نہ ہاریے، اور زور لگائیے۔ رفتار بڑھائیے۔ ابھی سمندر کے گربھ میں بہت کچھ ہے۔ آشا ہے، وہ سب کچھ بھی باہر آ جائے گا جو ابھی تک تہ میں پڑا ہوا ہے۔'' کرسی پر بیٹھے ایک نے رسّی کھینچنے والوں کی ہمت بڑھائی۔

زور اور رفتار دونوں میں اضافہ ہو گیا مگر دھیرے دھیرے چہروں پر مایوسی چھانے لگی۔ آنکھوں سے نا امیدی جھانکنے لگی۔ رسی کھینچنے کا عمل سست پڑنے لگا۔ مایوسی اور نا امیدی کی پرت گہری ہوتی گئی۔ اور اچانک منتھن کا کام رک گیا۔

دونوں طرف کے لوگ ان برتنوں کے اردگرد جا کر کھڑے ہو گئے جن میں ساگر سے نکلے ہوئے رتنوں کو رکھا گیا تھا۔

''دیکھیے، شانتی سے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیے اور دھیرج بنائے رکھیے۔ بس تھوڑی ہی دیر میں ہم ان رتنوں کی پریکشا کرنے والے ہیں۔'' اسٹیج سے ایک آواز گونجی۔

آواز سنتے ہی اسٹیج اور پنڈال دونوں طرف کی بدبداہٹیں رک گئیں۔ لوگ اپنی اپنی جگہ پر لوٹنے لگے۔

ایک آدمی برتن کے قریب پہنچا اور اس میں سے رقیق مادہ نکال کر اس نے کچھ لوگوں کو پینے کے لیے دیا۔

رقیق مادہ پیتے ہی وہ لوگ چکر کھا کر دھڑام سے زمین پر گر پڑے۔ان کے منہ سے نیلے رنگ کا جھاگ نکلنے لگا۔ کچھ دیر تک وہ مچھلی کی طرح تڑپتے رہے۔پھر سب نے آہستہ آہستہ اپنا دم توڑ دیا۔

ماحول میں خوف وہراس کی فضا چھا گئی۔

وہ آدمی دوسرے برتن کے پاس پہنچا اور اس میں سے رقیق مادہ نکال کر کچھ اور لوگوں کی طرف بڑھا۔ بڑی مشکل سے وہ لوگ اس رقیق شے کو اپنے لبوں سے لگا پائے۔ لبوں سے لگتے ہی ان کا حال بھی وہی ہوا جو پہلے برتن کے رقیق مادہ پینے والوں کا ہوا تھا۔

دہشت اور بڑھ گئی۔

ہمت کر کے اس آدمی نے تیسرے برتن سے رقیق شے نکال کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کچھ لوگوں کی طرف بڑھایا مگر اسے لینے کے لیے کوئی بھی ہاتھ آگے نہ بڑھ سکا۔

''سمبھو ہے یہ امرت ہو۔ دیکھیے ،اس کا رنگ بھی پہلے والے رتنوں سے بھن ہے۔آپ ہاتھ نہیں بڑھائیں گے تو کیسے پتا چلے گا کہ یہ کیا ہے؟ ویسے میں آپ کو وشواس دلاتا ہوں کہ یہ امرت ہے۔آپ اسے پیجیے اور پی کر امر ہو جایئے'' جب کوئی ہاتھ آگے نہیں بڑھا تو وہ بولا

''ٹھیک ہے اسے میں ہی پی کر دیکھتا ہوں۔'' ڈرتے ڈرتے اس شخص نے پیالے کو اپنے لبوں سے لگا لیا مگر اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔اسے پیتے ہی اس کا بھی وہی حشر ہوا جو دوسروں کا ہوا تھا۔

یہ دیکھتے ہی چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔لوگ حیرت اور خوف سے ان برتنوں کو تکنے لگے جس میں موجود رقیق شے نے کتنوں کی جان لے لی تھی۔

''اس بار امرت کیوں نہیں نکلا؟'' اسٹیج کے کسی آدمی کے منہ سے یہ جملہ سہما ہوا نکلا۔''

مگر اس سوال کا جواب کسی کے بھی منہ سے باہر نہیں آیا۔چاروں طرف خاموشی

چھائی رہی۔

''آج کا منتھن تو وچتر رہا۔'' کافی دیر بعد اسٹیج کا ایک آدمی بولا۔

''ہاں! پر ینام پہلے جیسا نہیں نکلا۔'' دوسرے نے سُر میں سُر ملایا۔

''آخر ایک ہی تتو کیوں نکلا؟ وہ بھی وش!''

''میں بھی تو اس پرشن سے پریشان ہوں۔''

''اس کا رہسیہ کیا ہو سکتا ہے؟''

''مجھے کیا پتا؟''

''کس کو پتا ہوگا؟ کس سے پوچھا جائے؟''

''سمبھو ہے گیا نیشور رشی کچھ پرکاش ڈال سکیں۔''

''تو ہمیں رشی جی کے پاس چلنا چاہیے۔''

''ساتھیوں! آپ سب یہیں رکیے، ہم لوگ گیا نیشور رشی کے پاس اس رہسیہ کا پتا لگانے جا رہے ہیں۔''

کرسی پر بیٹھے لوگوں میں سے کچھ لوگ اٹھ کر رشی گیا نیشور کے استھان کی طرف چل پڑے۔

پردہ گر گیا۔

دوسرا منظر

ایک ہرا بھرا باغ۔ باغ کے ایک کونے میں سجی سنوری کٹیا۔ کٹیا کے اندر مرگ چھالے پر آسن جمائے دھیان میں بیٹھے سنت گیا نیشور۔ پردے کے ایک طرف سے کچھ تھکے ہارے حیران و پریشان لوگ آنے والے لوگ گیا نیشور کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

کافی دیر بعد رشی نے آنکھیں کھولیں۔

''نمسکار منی ور!'' رشی کی کٹیا نمسکار کی آواز سے گونج اٹھی۔

''آپ لوگ کون ہیں اور کس لیے پدھارے ہیں؟'' رشی نے گردن اٹھا کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہم اسی نگری کے باس ہیں منی ور! ایک سمسیا کا سمادھان چاہتے ہیں۔''

''سمسیا کیا ہے؟''

''امرت۔''

''تنک کھول کر بتایئے۔''

''جی منی ور! بات یہ ہے مہاراج کہ ہم نے سمندر منتھن کیا، پرنتو اس بار اس میں سے کیول ایک پدارتھ، ایک تتو نکلا۔

''کیول ایک تتو؟'' رشی کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ہاں منی ور! ماترا ایک تتو۔''

''وہ تتو امرت ہوگا؟''

''نہیں، وہ وِش ہے منی ور!''

''وش ہے!'' رشی کی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔

''امرت تو نکلا ہی نہیں، منی ور۔''

''پرنتو یہ کیسے پتا چلا کہ ساگر سے جو رتن نکلا ہے وہ امرت نہیں، وِش ہے؟''

''پریکشا کے پشچات منی ور! اسے کچھ لوگوں کو پینے کے لیے دیا گیا پرنتو اسے ہونٹوں سے لگاتے ہی وہ لوگ زمین پر گر پڑے۔ پہلے ان کے منہ سے جھاگ نکلا۔ پھر پورا شریر نیلا پڑ گیا اور وہ...''

''اوہ!'' گیانیشور منی چنتت ہو اُٹھے۔

''منی ور! اس بار منتھن سے امرت کیوں نہیں نکلا؟''

رشی خاموش رہے اور ان کے ماتھے پر پہلے سے زیادہ لکیریں ابھر آئیں۔

یہ دیکھ کر کہ گیانیشور منی آنکھیں موند کر دھیان میں لین ہو گئے ہیں، کسی نے پھر

کوئی سوال نہیں کیا۔ کافی دیر بعد بھی جب رشی اپنے دھیان سے باہر نہیں آئے تو ان میں سے ایک نے پھر وہی سوال دہرایا۔

''منی ور! اس بار منتھن سے امرت کیوں نہیں نکلا؟''

دھیان سے باہر آتے ہوئے رشی نے نہایت گمبھیر لہجے میں جواب دیا، ''امرت ہوتب تو نکلے۔''

''ہم سمجھے نہیں منی ور!''

''ساگر کے گربھ سے امرت پہلے ہی نکل چکا ہے۔''

''کیا؟'' ایک ساتھ سبھی چونکے۔''

''ہاں اسے نکال کر کچھ لوگوں نے پہلے ہی پی لیا ہے۔''

''کچھ لوگوں نے پی لیا ہے! کس طرح منی ور؟''

''متھ کر۔''

''تو کیا ہم سے پہلے بھی ساگر متھ چکا ہے۔''

''ہاں۔''

''منی ور! وہ کون ہیں جنھوں نے ہم سے پہلے ساگر کو متھ لیا۔ منی ور کہیں آپ کا اشارہ دیوتاؤں کی اور تو نہیں ہے؟''

''نہیں، دیوتاؤں نے تو بہت پہلے متھا تھا۔ یہ ان کے بعد کی بات ہے۔''

''منی ور یہ کب کی بات ہے اور منتھن کرنے والے کون ہیں؟''

''یہ کچھ دنوں کی بات ہے اور متھنے والے بھی تمھارے ہی بیچ کے لوگ ہیں۔''

''ہمارے بیچ کے؟''

''ہاں، وہ تمھارے ہی بیچ رہتے ہیں۔''

''ان کا کچھ اتا پتا منی ور؟''

''ہم اس سے ادھیک نہیں بتا سکتے کہ وہ کسی اور لوک کے باسی نہیں بلکہ تمھاری ہی

دھرتی پر تمھارے ہی ساتھ رہتے ہیں۔''

''اب کیا ہوگا منی ور؟''

''اُپچار۔''

''کیسا اُپچار منی ور؟''

''امرت کی پونبہ پراپتی کا اُپچار۔''

''کیا ایسا؟ ہو سکتا ہے؟''

''ہاں، ہو سکتا ہے۔''

''کیا یہ سمبھو ہے؟''

''سمبھو ہے پر____''

''پر کیا منی ور؟''

''اُپچار سرل نہیں ہے۔ بہت ہی کٹھن اور کشٹ دائک۔ ہے۔''

''امرت کے لیے ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ سب کچھ سہہ لیں گے۔ آپ بتایئے تو سہی۔''

''جن لوگوں نے امرت پیا ہے، ان کے بھیتر سے اسے کھینچنا ہوگا۔''

''ان کے بھیتر سے؟''

''ہاں ان کے بھیتر سے۔ ارتھات ان کے شریر سے۔''

''پرنتو یہ کیسے سمبھو ہے منی ور؟''

''سمبھو اس پرکار ہے کہ امرت ابھی بھلی بھانتی ان کے شریر میں گھلا ملا نہیں ہے۔ ارسات وہ اسے پوری طرح پچا نہیں پائے ہیں۔ اُپچار سے اب بھی امرت ان کے شریر سے باہر نکل سکتا ہے۔''

''کیا اُپ چار کرنا ہوگا منی ور؟''

''یہ کاریہ میرا نہیں۔ اُپچار آپ کو سوچنا ہے۔ اسے آپ کو ڈھونڈنا ہے۔ ہمارا

کار یہ کیول مارگ درشن تھا، سو ہم نے کر دیا۔''

''منی ور!''

''بولیے۔''

''اچھا یہ تو بتا دیجیے کہ اس وش کا کیا ہوگا؟''

''اسے تو کسی نہ کسی کو پینا ہی پڑے گا۔ اینتھا یہ سموچے سنسار کو وشیلا کر دے گا۔ اس سے سرشٹی ہی نشٹ ہو جائے گی۔''

''اس کے لیے کوئی اُپچار منی ور؟''

''اس کا اُپچار بھی آپ کو سوچنا ہوگا۔''

''دھنیہ واد منی ور!''

''کلیان ہو۔''

وش کے برتن اٹھا کر وہ لوگ گیا نیشور منی کے کٹیا سے باہر نکل آئے۔

پردہ گر گیا۔

تیسرا منظر

[چندنی چنتنی پیشانی، دھیانی گیانی نین، جوگیائی بال اور سادھوئی لباس میں کچھ لوگ گمبھیر مدرا میں چھالے پر براجمان۔]

ایک آدمی کھڑا ہوا۔

''سبھا پتی مہودے تتھا اپستھت و چارک گنڑ! رشی گیا نیشور مہاراج نے جس اُپچار کی بات کی ہے اس سے سمبندھت کچھ مول پرشن میں سبھا کے پٹل پر رکھنے کی انومتی چاہتا ہوں۔''

''انومتی ہے۔'' ایک ساتھ کئی آواز گونجیں۔

''دھنیہ واد! ہمارا پہلا پرشن ہے، امرت پینے والے کون ہیں؟ دوسرا مہتو پورن پرشن یہ ہے کہ امرت پینے والوں کے شریر سے امرت نکالنے کا اُپ چار کیا ہوگا؟ اور تیسرا

پرشن ہے، وش کو کیسے ٹھکانے لگایا جائے ارتھات اسے کیسے اور کسے پلایا جائے تا کہ سنسار کو نشٹ ہونے سے بچایا جا سکے؟''

سنچالک کے سوال سن کر مرگ چھالے پر براجمان لوگوں میں سے ایک نے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تو ہمیں یہ پتا لگانا ہوگا کہ امرت پینے والے کون ہیں؟ یدی وہ ہمارے بیچ کے لوگ ہیں جیسا کہ گیا نیشور رشی نے سنکیت دیا، تو ان کی پہچان کیا ہے؟ یدی ان کی پہچان ہمیں مل جاتی ہے تو ان کے بھیتر سے امرت نکالنے کے اُپچار پر وچار کرنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔''

دوسرا بولا، ''میرے وچار سے تو پہلے ہمیں اُپچار پر دھیان دینا چاہیے؟ اتنا پتا تو چل ہی چکا ہے کہ امرت پینے والے ہمارے ہی بیچ رہتے ہیں۔ اتہہ ان لوگوں کا پتا لگانا کوئی مشکل نہیں ہے پرنتو شریر سے امرت نکالنے کا اُپچار تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں اس اور ترنت دھیان دینے کی آوشکیتا ہے۔''

تیسرے آدمی نے دوسرے آدمی کے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا، ''آپ کا سوچنا اُچت ہے۔ ہمیں اُپچار پر پہلے دھیان دینا چاہیے۔ میرے وچار سے تو اس کے لیے وہی اوپائے اپنانا ہوگا جو مویشی کے ذریعے شیر کے شکار کے لیے اپنایا جاتا ہے۔ ارتھات ہمیں شڈینتر رچنا پڑے گا۔''

''شڈینتر!'' پہلا آدمی چونکا۔

''ہاں شڈینتر! شیر کو پکڑنے کے لیے مچان بنانا ہوتا ہے۔ بچھڑا باندھنا پڑتا ہے اور نگاہ ٹکا کر بیٹھنا پڑتا ہے۔''

''تو آپ کا تات پریہ یہ ہے کہ امرت نکالنے کے لیے بھی ہمیں کوئی ایسا ہی شڈینتر رچنا پڑے گا۔'' اب تک خاموش رہنے والے چوتھے آدمی نے لب کھولے۔

''جی۔''

''پرنتو اس کٹھن کاریہ میں کیول شڈینتر سے کام نہیں چلے گا۔ شڈینتر کے ساتھ

ساتھ ہمیں مہابھارت کی بھانتی کوئی چکرویو بھی رچنا ہوگا۔'' دوسرے نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''یہ سب تو ٹھیک ہے پرنتو، پہلے یہ تو پتا چلے کہ یہ شڈ یںتر رچنا کس کے لیے ہے؟ چکرویو کس کے لیے بنانا ہے؟''

پہلے آدمی نے اپنے خیال کو ایک بار پھر دہرا دیا۔

''ہاں! پہلے تو یہ گیات ہونا چاہیے کہ شیر ہے کون؟ میرے وچار سے تو اس کے لیے ہمیں گپت چر لگا دینے چاہییں۔'' ایک اور آدمی نے پہلے آدمی کے خیال کی تائید کرتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کی۔

''نہیں، یہ کام گپت چر کے بس کا نہیں ہے۔'' پہلے آدمی نے آخری آدمی کی تردید کی۔

''تو؟'' آخری آدمی نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس کے لیے چنتن منن کی آوشیکتا ہے۔''

''اس کاریہ کی ذمے داری چنتکوں کو سنبھالنی چاہیے۔ اس کے لیے انھیں آگے آنا چاہیے۔''

''یہ بات ادھیک ترک سنگت لگ رہی ہے۔ ہمیں یہ کام اپنے چنتکوں کو سونپ دینا چاہیے۔ ان سے یہ بھی انورودھ کرنا چاہیے کہ وہ امرت نکالنے کے اُپچار پر بھی چنتن منن کریں اور وِش کو ٹھکانے لگانے کا اُپائے بھی سوچیں۔''

کئی لوگوں نے اس خیال سے اتفاق کیا۔

''دھنیہ واد پرستاؤ کے ساتھ آج کی سبھا کی سماپتی کی گھوشنا کی جاتی ہے۔''

پردہ گر گیا۔

چوتھا منظر

(پُراسرار ماحول۔ گمبھیر مدرا میں بیٹھے چنتک گنتر۔ پلکیں بند، آنکھیں کھلی

ہوئیں۔)

یکا یک ایک چنتک کی پیشانی چمک اُٹھی۔اس کے چہرے پر اطمینان کا چراغ روشن ہوگیا۔

کچھ دیر بعد ایک اور چنتک کی پلکیں کھل گئیں۔اس کے دیدوں کے دیے بھی جھلملا اُٹھے۔

دونوں نے فرش پر پڑے کاغذوں کے ٹرے میں سے ایک ایک کاغذ اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیے اوران پر جلدی جلدی کچھ لکھنے لگے۔لکھ لینے کے بعد دونوں نے اپنے اپنے کاغذ ایک دوسرے کی طرف بڑھادیے۔۔

دونوں دیر تک تحریوں پر اپنی نظریں گڑائے رہے۔پھران دونوں کاغذوں کو بار باری سے باقی تمام چنتکوں کی طرف بڑھادیا گیا۔

کاغذ کی تحریروں کو پڑھتے ہی تمام چہروں پر اطمینان کی کرن جھلملا اٹھی۔

تحریریں پڑھ لینے کے بعد سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔آنکھوں آنکھوں میں بات ہوئی اوران میں سے ایک شخص کھڑا ہوا گیا۔

''سمسیا کی گمبھیرتا اوراس سے سمبندھت جٹلتا کو دیکھتے ہوئے کافی سوچ وچار اور چنتن منن کے بعد جس نش کرش پر پہنچا گیا،وہ یہ ہے کہ وِش کو ٹھکانے لگانے اوراس سرشٹی کو بچانے کا اوپائے یہ ہے کہ اسے (وش کو) ان لوگوں کو پلا دیا جائے جن کے دماغ میں سوچنے کی شکتی نہیں ہے اور جن کے شریر بے کار اور سڑ گل گئے ہیں۔چنتن ہین مستشک اور سڑے گلے بے کار شریر والے لوگوں کو جیوت رہنے سے اچھا ہے کہ وہ مرجائیں۔اس سے وِش کی کھپت بھی ہوجائے گی اور اچھے دماغ اور مضبوط شریر کی رکشا بھی ہوسکے گی۔ان کا مرنا اس لیے بھی آوشیک ہے کہ ان سے دھرتی پر سڑاندھ پھیلنے کا خطرہ ہے۔''

ہمارے گھور چنتن کے انوسار امرت ان لوگوں نے پیا ہے جو ہم میں رہ کر بھی ہم سے الگ ہیں۔ان کی پرورتی دوب سے ملتی جلتی ہے اور جو اگنی کی بھانتی پھیلتے ہیں اور ہوا

کے سمان بڑھتے ہیں اور جو سمندر کی بھانتی گہرے ہیں۔ شریر سے امرت نکالنے کے اُپ چار کے سمندھ میں جو وِدھیاں ہمارے چنتن منن نے ہمیں بجھائی ہیں، وہ یہ ہیں:

پہلی ودھی۔	چیرا کرن
دوسری ودھی۔	لنکا دہن
تیسری ودھی۔	سمبندھ وِچھیدن
چوتھی ودھی۔	سمتی سماپن

''اور ایک انتم ودھی یہ بھی ہوسکتی ہے۔'' ایک چنتک جو ابھی تک چنتن میں ڈوبا ہوا تھا، بول پڑا۔

''کون سی وِدھی؟'' ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں۔

''وشاروپن''

''وشاروپن!''

''ہاں، وشاروپن۔ وِش روپنے سے امرت کا پشپ باہر آ سکتا ہے۔''

''وہ بھلا کیسے؟''

''جب اس ودھی کو پریوگ میں لایا جائے گا تو سب کچھ اپنے آپ سمجھ میں آجائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم اسے بھی ان وِدھیوں میں شامل کر لیتے ہیں۔ اب ہمارا اگلا چرن یہ ہوگا کہ ہم ان وِدھیوں کو ان کے پورن وِورن کے ساتھ ساتھ ہی امرت پینے والوں کی پہچان کی نشانیوں اور مستشک ہین ایوم گلے سڑے شریر والے لوگوں کے پتے اپنے کرم کانڈھ جتھے کے حوالے کر دیں تا کہ بنا دیر کیے عملی کاروائی شروع کی جا سکے۔''

''مجھے آشا ہی نہیں، پورن وشواس ہے کہ ہمارا پرشرم اوشیہ رنگ لائے گا اور ہم اپنے مشن میں جلد ہی سپھل ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی آج کی سبھا سماپت کی جاتی ہے۔ دھنیہ واد۔''

پردہ گر گیا۔

تماشا ختم ہوگیا۔ نائک منڈلی اپنے ساز و سامان سمیٹ کر کسی دوسرے شہر کی طرف روانہ ہوگئی۔ تماشائی کلا بھون سے نکل کر مختلف کیفیات و احساسات کے ساتھ اپنے ٹھکانوں کو لوٹنے لگے۔

کچھ لوگوں کی رفتار میں مستی اور چہرے پر سرشاری تھی۔ ان کی نظریں پتلیوں سے نکل کر دوب، اگنی، ہوا اور سمندر سے ملتی جلتی خصلتوں والے لوگوں کی تلاش میں نکل پڑی تھیں۔

کچھ لوگوں کی رفتار سست اور سنجیدہ تھی۔ ان کے چہروں پر فکرمندی اور اندیشوں کے تاثرات تن گئے تھے۔ ان کے ذہنوں میں نائک کے منظر، پیکر اور پہلو بار بار ابھر رہے تھے۔ ہر منظر کا پس منظر بھی ابھر رہا تھا اور اس کا پیش منظر بھی۔ ہر پیکر کا ہیولا دیو ہیکل کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا اور ہر پیکر اور پہلو سے پہیلیاں جھانک رہی تھیں اور ہر پہیلی اپنے حل کی طرف مبہم اشارے کر رہی تھی۔

ذہن منظر، پس منظر اور پیش منظر میں رشتہ تلاش کرنے اور پیکروں، پہلوؤں اور پہیلیوں کو جاننے بوجھنے میں منہمک ہو گیا تھا۔

بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ انھیں یاد آ رہا تھا کہ ساگر منتھن کا قصہ وہ نہیں تھا جسے وہ کلا بھون میں دیکھ کر آ رہے تھے۔ وہ منتھن تو دیوتاؤں اور راکشسوں نے مل کر کیا تھا۔ وہ منتھن بھگوان بھولے ناتھ وِش ہرن، نیل کنٹھ، شیو شنکر کے کہنے پر سنسار کے کلیان کے لیے کیا گیا تھا۔ اس منتھن میں ساگر کے گربھ سے صرف وِش ہی نہیں نکلا تھا بلکہ بہت سارے قیمتی رتن بھی باہر آئے تھے۔ اُن میں امرت بھی تھا۔ امرت کے علاوہ ان میں دھنونتری وید تھا۔ لکشمی تھی، رمبھا تھی، منتری اور شنکھ تھے۔ گجراج اور ششی تھے، اور یہ سارے کے سارے رتن منشیہ کے کلیان کے لیے تھے۔ البتہ وِش وناش کاری ضرور تھا مگر اسے بھگوان شنکر نے اپنے گلے میں اتار کر سنسار اور سرشٹی کو تباہ ہونے سے بچا لیا تھا لیکن

آج کے اسٹیج پر دکھایا گیا منتھن تو بالکل الگ تھا۔ اس منتھن میں تو صرف ایک رتن نکلا تھا۔ وہ بھی وش، جسے ٹھکانے لگانے کا اوپائے یہ ڈھونڈا گیا کہ اسے ایسے لوگوں کو پلا دیا جائے جن کے دماغ اور جسم دونوں کم زور ہیں۔

انھیں یاد آ رہا تھا کہ اس منتھن کے قصے میں ایک راکشس کا سر دھڑ سے اڑا دیا گیا تھا۔ اس لیے کہ اس نے چھل کپٹ سے امرت پی لیا تھا۔ بھگوان شیو نے اس کا سر اس لیے قلم کر دیا کہ راکشس بھی امر نہ ہو جائے۔ اس لیے کہ راکشس بدی کی علامت ہے۔ بدی اگر امر ہو گئی تو اس کے پربھاؤ سے سنسار سنکٹ میں پڑ جائے گا۔ سرشٹی نشٹ ہو جائے گی۔ منشیہ اور دیوتا اپنا صبر و سکون کھو دیں گے مگر اس منتھن میں تو انسانوں کے جسم سے امرت نکالنے کی بات کی گئی تھی۔ یہ کیسے چنتک تھے جنھوں نے انسانوں کو ٹھکانے لگانے، انھیں جلانے ان کے اندر زہر بونے اور ان کی سمپتی کو سماپت کرنے کا بھاؤ دیا۔ ان چنتکوں میں تو رشی منی بھی تھے۔ رشی منی جو منشیہ کے کلیان اور سرشٹی کی رکشا کے لیے اپنے پران بھی تیاگ دیتے تھے۔

ان کی آنکھوں میں مہارشی دودھچی ابھر آئے۔ دد ھچی جنھوں نے اسروں سے سرشٹی کی رکشا کے لیے اپنے پران تیاگ کر اپنی استھیوں کے شستر گانڈیو، اجگو اور سارنگ، شنکر، اندر اور وشنو کو سونپ دیے تھے جن کے وار سے برتر اسُر کا ودھ ہوا۔

''یہ کیسا منتھن ہے؟ اس کے بارے میں تو کبھی سنا بھی نہیں اور نہ ہی کہیں پڑھا۔ کہیں یہ کوئی گڑھا ہوا واقعہ تو نہیں؟''

ان میں سے ایک نے اپنے ساتھ چل رہے ساتھی سے پوچھا؟

''یہ تو وہی جانیں''۔

اگر ایسا ہے تو اس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟'' پہلے والے نے سوال کیا۔

''یار! ان جملوں کا اشارہ کن کی طرف تھا؟''

''کن جملوں کا؟''

''یہی کہ وہ کون ہیں جن کی پرورتی دوب سے ملتی جلتی ہے؟''

جو اگنی کی بھانتی پھیلتے ہیں۔

ہوا کے سمان بڑھتے ہیں۔

اور سمندر کی بھانتی گہرے ہیں۔

جن کے بھیتر سے امرت نکالنا ہے۔

اور جس کے لیے چنتکوں نے چیرا کرن، لنکا دہن، سمبندھ وِچھیدن، سمپتی سماپن اور وشارو پن جیسی ودھیاں بجھائی ہیں؟

ان کے بھیتر بھی منتھن ہونے لگا تھا اور آنکھوں کے سامنے بھگوان شنکر کا ترشول کسی اور کے ہاتھ میں لہرا رہا تھا کچھ لوگوں کی رفتار لڑکھڑا رہی تھی۔ ان کے چہروں کی سیاہی میں زردی بھی گھل گئی تھی۔

ان کے کانوں میں بار بار یہ آواز گونج رہی تھی۔

''وِش ان لوگوں کو پلا دیا جائے جن کے دماغ میں سوچنے کی شکتی نہیں ہے اور جن کا شریر کم زور تتھا سڑ گل گئے ہیں۔ چنتن ہین مستشک اور سڑے گلے بے کار شریر والے لوگوں کو جیوت رہنے سے اچھا ہے کہ وہ مر جائیں۔ اس سے وِش کی کھپت بھی ہو جائے گی اور اچھے دماغ اور مضبوط شریر کی رکشا بھی ہو سکے گی۔ ان کا مرنا اس لیے بھی آوشیک ہے کہ ان سے دھرتی پر سڑاند پھیلنے کا خطرہ ہے۔''

اور آنکھوں میں منتھن کی رسّی کھینچنے والا ایک آدمی بار بار لڑکھڑا کر زمین پر گر رہا تھا ہر قدم پر انھیں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی پیالہ آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھا رہا ہے۔

ایک بڑا کھیل

ریموٹ کا بٹن دبتے ہی ٹی۔وی کے اسکرین پر ایک عجیب وغریب تصویر ابھر آئی۔ دو چہروں کے چشم ولب ورخسار آپس میں اس طرح گڈمڈ کر دیے گئے تھے کہ اس تصویر میں کئی چہروں کا گمان ہوتا تھا۔ وہ لب، چشم اور رخسار تھے تو جانے پہچانے فلمی ستاروں کے مگر ملائے اس طرح گئے تھے کہ صاف صاف کوئی ایک تصویر نہیں بن پا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر پہچاننا دشوار تھا کہ اصل تصویر کس کی ہے؟ کیوں کہ کسی طرف سے کوئی چہرہ دکھائی دیتا تھا تو کسی طرف سے کوئی۔ ایک جانب سے دیکھیے تو کوئی اور نظر آتا تھا اور دوسری جانب سے نگاہ ڈالیے تو کوئی اور۔

اس تصویر کے ساتھ ہی سماعت کے پردے سے ایک آواز بھی ٹکرانے لگی جو اسکرین پر ابھرنے والی عام آوازوں سے قدرے مختلف تھی:

''پہچانیے اور پائیے پچاس ہزار کا نقد پُرسکار۔ جلدی اپنا موبائل اٹھائیے اور نمبر گھمائیے: 9990237388 کیا پتا آپ ہی وہ مقدر کے سکندر ہوں جس کے اکاؤنٹ میں جانے کے لیے پچاس ہزار کے کڑکڑاتے ہوئے نوٹ کب سے پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ دیر مت کیجیے۔ فوراً ڈائل کیجیے۔ نمبر آپ کے اسکرین پر موجود ہے۔ یاد رکھیے، وقت کم ہے اور امیدوار بہت زیادہ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بازی کوئی اور مار لے جائے۔''

یہ پرکشش اور دل فریب آواز تیکھے نین نقش والی ایک ایسی حسینہ کے مے ارغوانی

سے لبریزلبِ لعلیں سے نکل رہی تھی جس کا نیم عریاں سراپا بھی بول رہا تھا۔

میری نگاہیں جو آواز سنتے وقت مدہوش کن سراپے پر مرکوز ہوگئی تھیں پچاس ہزار کے لالچ میں جیتے جاگتے جسم سے اتر کر اسکرین والی تصویر کے پاس سرک آئیں۔

کمنٹری کے جوشیلے اور لبھاونے بول اور پچاس ہزار کے لہراتے ہوئے نوٹ ذہن کو تازیانے لگانے لگے۔اس تازیانے پر اشہب دماغ برق رفتاری سے دوڑنے لگا:

نگاہیں مختلف صورتوں کو گھورتی اور مختلف چہروں کے خط وخال کو نہارتی ہوئی ایک فلمی ستارے کے تاب دار چہرے پر جا رکیں۔یہ ستارہ وہ تھا جو پردۂ سیمیں پر طرح طرح سے چمکا تھا۔الگ الگ رنگوں میں دمکا تھا۔کبھی مہم جوئی کے معرکے سر کیے تھے تو کبھی شجاعت و دلیری کے کارنامے سرانجام دیے تھے۔کبھی ہیروئن کو ویلن کے چنگل سے چھڑایا تھا تو کبھی کسی شریف انسان کو بدمعاشوں کے نرغے سے نکالا تھا۔کبھی کسی ڈوبتے ہوئے بچّے کو دریا میں کود کر ڈوبنے سے بچایا تھا تو کبھی جلتے ہوئے گھر میں داخل ہو کر کسی بوڑھے کو آگ کی لپٹوں کے گھیرے سے باہر نکال لایا تھا۔کبھی اپنی جان جوکھم میں ڈال کر ایک ایسے گروہ کا پردہ فاش کیا تھا جو مختلف محکموں سے خفیہ کاغذات چرا کر غیر ملکیوں کے ہاتھوں بیچ رہا تھا۔کبھی تنِ تنہا ڈاکوؤں سے مقابلہ کر کے گاؤں والوں کے جان و مال کو بچایا تھا۔کبھی کسی محاذ پر غنڈوں کے تخریبی منصوبوں کے پرخچے اُڑاتے تھے تو کسی سرحد پر دشمنوں کے چھکّے چھڑاتے تھے۔

کچھ دیر تک اس ستارے کے پاس رکی رہنے کے بعد نگاہیں اڑ کر کسی اور مشہور ستارے کے پاس جا پہنچیں۔

وہ ستارہ ایسا تھا جس نے درجنوں فلموں میں لڑکیوں کی عزّتیں لوٹی تھیں۔اپنے وطن کو دشمنوں کے ہاتھ بیچنے کی سازش کی تھی۔سیکڑوں بے گنہ انسانوں کو بم سے اُڑا دیا تھا۔کتنی ہی بستیوں کو آگ میں جھلس ڈالا تھا۔بے شمار بچّوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر بھیک مانگنے کے لیے انھیں شہر کے نکڑوں پر بٹھا دیا تھا۔

اس تصویر میں یہ دونوں چہرے موجود تھے مگر اس تصویر کا اصل چہرہ کون تھا یہ پہچاننا مشکل تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف سے دیکھنے پر وہ ہیرو کی تصویر لگنے لگتی تھی اور دوسری جانب سے نظر ڈالنے پر ویلن کی بن جاتی تھی۔

اس کی شناخت بھی مشکل تھی کہ اگر وہ کسی ہیرو کی تصویر تھی تو کس ہیرو کی اور اگر کسی ویلن کی تھی تو کس ویلن کی ؟ اس لیے کہ چہرے کی آنکھیں، لب اور رخسار ہماری نظروں کو مختلف ایسی شکلوں تک لے جاتے تھے جو اس طرح کے کاموں میں مصروف رہا کرتے تھے۔

''جلدی کیجیے، وقت بہت کم ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ سوچتے ہی رہ جائیں اور کوئی دوسرا۔۔۔ اور سنیے رقم پچاس ہزار سے بڑھ کر اب ساٹھ ہزار ہو چکی ہے''

کمنٹری جاری تھی۔ خوبصورت اناؤنسر نہایت جوش و خروش کے لہجے میں نئے نئے لفظوں اور فقروں کے اضافے کے ساتھ اپنی آواز کا جادو جگا رہی تھی۔ اس کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ اس کا سراپا ہمہ وقت حرکت میں رہتا تھا اور اس کے جسم کے بعض حصے و فورِ جوش میں گیند کی طرح اچھل اچھل پڑتے تھے۔

میرا دماغ آدھی ادھوری آنکھوں، بگڑے ہوئے ہونٹوں اور کٹے پھٹے رخساروں کو جوڑنے اور ان کے جوڑ سے ایک سالم چہرہ بنانے میں مصروف تھا۔ ذہن مختلف زاویوں سے سوچ رہا تھا۔ نگاہیں تیزی سے اپنا زاویہ بدل رہی تھیں۔ نقش ابھر کر ڈوب جاتے تھے۔ تصویر بنتے بنتے بگڑ جاتی تھی۔ شناخت ہوتے ہوتے رہ جاتی تھی۔

انعام کی رقم بڑھتی جا رہی تھی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور ادھر ذہن تھا کہ دھند میں الجھا ہوا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک شور سا اُٹھا اور آنکھوں کے سامنے ایک منظر ابھرنے لگا:

ایک طرف سے کمان کی شکل کا ایک رتھ ابھرا۔ رتھ کا اگلا حصہ غائب تھا۔ جہاں

سے اگلا حصہ غائب تھا وہاں پر ایک اونچی سی کرسی پر شاہی لباس میں راجا نما کوئی شخص براجمان تھا۔اس شخص کے چہرے پر آہنی خود تھا۔داہنے ہاتھ کی مٹھی میں کوئی سفید سی ڈبیا تھی جس پر بار بار اس کا انگوٹھا دباؤ ڈال رہا تھا۔دوسرے ہاتھ میں باگ ڈور تھی۔کمان نما رتھ سے تیر چھوٹ رہے تھے۔تیروں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔شعلے برس رہے تھے۔ رتھ تیزی سے آگ برساتا ہوا اس طرف کو بڑھ گیا جدھر سورج آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ویسا ہی ایک رتھ سورج والی سمت سے نکلا اور اپنی مخالف دشا میں بڑھنے لگا۔اس رتھ کا بھی اگلا حصہ نہیں تھا۔اس میں بھی سر پر آہنی خود والا ایک شخص بیٹھا تھا۔ بائیں ہاتھ میں اس کے بھی لگام تھی اور داہنے ہاتھ کی مٹھی میں ایک سفید ڈبیا دبی تھی جس پر انگوٹھا رہ رہ کر دباؤ ڈال رہا تھا۔اس رتھ سے بھی تیر وتفنگ کی بارشیں ہو رہی تھیں اور ان سے بھی شعلے نکل رہے تھے۔چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔

یہ رتھ بھی ایک طرف سے آیا اور آگ برساتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

رتھ تو غائب ہو گئے مگر ان کے تیروں کے شعلے باقی رہ گئے۔شعلوں کے نیچے سرسبز زمین تھی جس کے سبزے تیزی سے راکھ ہوتے جا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد دونوں رتھ دونوں سمتوں سے نکل کر پردے پر آ گئے اور آگے بڑھتے ہوئے اس طرح ایک دوسرے کے قریب ہو گئے کہ ان میں سے ایک دوسرے کی اوٹ میں چھپ گیا۔کون سا رتھ چھپ گیا تھا اور کون سا دکھائی دے رہا تھا یہ بتانا مشکل ہے۔دونوں رتھوں کے آہنی خود والے آدمی بھی ایک ہو گئے تھے۔یعنی ان دونوں میں سے ایک ہی شخص دکھائی دے رہا تھا۔دونوں ایک دوسرے کی اوٹ میں اس طرح آ گئے تھے جیسے ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہوں۔ٹھیک ویسے ہی جیسے جادوئی فلموں میں ایک شخص اپنا شریر تیاگ کر دوسرے میں سما جاتا ہے۔

یہ منظر دیکھتے ہی میری آنکھوں میں یکا یک ایک کہانی کے اوراق کھل گئے:

ایک صفحے پر درندوں کے ہوس کی شکار قریب سترہ برس کی گورے رنگ والی ایک خوبصورت سی لڑکی جس کی آنکھیں بڑی بڑی، بال سیاہ، داہنے گال پر موٹا سا تل تھا مانند لاش بے حس وحرکت پڑی تھی۔

دوسرے صفحے پر بلوائیو کا جتھا تھا جن کے جور وستم کی تاب نہ لاکر بے شمار لاشوں کے انبار میں اس لڑکی کی ماں بھی پڑی تھی جس کی ساری انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔

اور تیسرے صفحے پر رضا کاروں کا ایک دستہ تھا جس سے اس لڑکی کا باپ گڑگڑا کر التجا کر رہا تھا کہ وہ لڑکی اس کی اکلوتی بیٹی ہے۔ وہ بہت خوبصورت ہے۔ اُس کی طرح نہیں ہے بلکہ اپنی ماں پر گئی ہے۔ اسے ڈھونڈ لاؤ خدا تمھارا بھلا کرے گا اور رضا کار نوجوان بڑے جذبے کے ساتھ بوڑھے باپ کو یقین دلا رہے تھے کہ اس کی بیٹی زندہ ہوئی تو چند ہی دنوں میں اس کے پاس ہوگی۔

اس صفحے پر یہ بھی درج تھا کہ ان رضا کار نوجوانوں نے ہر طرح سے لڑکی کی دلجوئی کی۔ اسے کھانا کھلایا، دودھ پلایا اور لاری میں بٹھایا اور یہ بھی لکھا تھا کہ ایک دن باپ نے کیمپ میں ان رضا کار نوجوانوں کو دیکھا۔ لاری میں بیٹھے تھے۔ وہ بھاگا بھاگا ان کے پاس گیا۔ لاری چلنے ہی والی تھی کہ اس نے پوچھا، بیٹا! میری بیٹی کا پتا چلا؟ سب نے ایک زبان ہوکر کہا ''چل جائے گا چل جائے گا'' اور لاری چلا دی۔

کہانی کے کھلتے ہی تصویر میں گڈمڈ ہوئے ہوئے چشم ولب ورخسار کھٹا کھٹ ایک دوسرے سے ملتے اور ہم آہنگ ہوتے چلے گئے اور آدے ادھورے، ٹیڑھے میڑھے اور بے ترتیب خط وخال سے ایک واضح اور سالم چہرہ ابھر آیا۔

اس چہرے کو دیکھ کر میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ میری انگلیوں نے فوراً انعام دلانے والے نمبروں کے بٹن دبا دیے۔

''مبارک ہو آپ کا نمبر لگ گیا ہے۔ آپ کے لک نے ساتھ دیا اور آپ کیوں میں لگ گئے، کسی وقت بھی آپ سے جواب پوچھا جاسکتا ہے۔ موبائل رکھیے گا نہیں، آپ کی

قسمت لب بام ہے، کبھی بھی آپ کا لک زور مار سکتا ہے۔''

تصویر کی شناخت میں نے کرلی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میرا قیاس غلط نہیں ہوگا اور ستر ہزار کا انعام مجھے ہی ملے گا۔ اسی لیے میں بے چینی سے اُس کال کا انتظار کر رہا تھا جس میں مجھ سے پوچھا جانے والا تھا کہ میں اپنا جواب بتاؤں۔

میری دھڑکنیں بڑھتی جارہی تھیں۔ دھڑکنوں کی بڑھتی ہوئی رفتار کی وجہ صرف انعام کا لالچ ہی نہیں تھا بلکہ میری وہ خوشی بھی تھی جو تصویر کی شناخت کر لینے پر میرے رگ و پے میں جاری وساری ہوگئی تھی اور اسکی ایک وجہ میری وہ حیرت بھی تھی جو تصویر کی شناخت کے بعد میرے ذہن ونظر میں بھر گئی تھی۔

صدائے سحر ساز کے انتظار کی کیفیت شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔ ہونے والی تاخیر میری تشویش بھی بڑھاتی جارہی تھی۔ تشویش کے ساتھ یہ فکر بھی لاحق ہوتی جارہی تھی کہ موبائل کا میٹر بڑھتا جارہا تھا اور میرے پیسے کٹتے جارہے تھے۔

جب کافی دیر ہوگئی اور یہ بات ذہن میں گھر کرنے لگی کہ کال کے انتظار میں میں اپنی کافی رقم گنوا چکا ہوں اور ممکن ہے اب بہت کم بچی رہ گئی ہو اور کہیں ایسا نہ ہو کہ بالکل ہی ختم ہوجائے تو یہ خیال بھی آیا کہ موبائل بند کردوں مگر کسی دباؤ نے مجھے ایسا کرنے نہیں دیا۔ شاید صحیح شناخت کے زعم اور انعام کے طمع نے مرے موبائل کو کان سے ہٹنے نہیں دیا۔

میرا موبائل میرے کان سے اس طرح چپکا ہوا تھا جیسے کسی پارک کے کسی کونے میں کوئی عاشق کسی عارضی معشوق کے جسم سے چپکا رہتا ہے۔ سماعت کو ایک ایسی صدا کا بے؟ بری سے انتظار تھا جس کی دھمک سے میرے دل ودماغ کے ساتھ ساتھ میرے گھر کے درودیوار اور آس پاس میں بھی بلکہ دور دور تک بھی دھماکا ہوسکتا تھا۔

خوبصورت لبوں سے پرکشش کمنٹری جاری تھی۔ پردے پر بے ترتیب خدوخال والی بے شناخت تصویر توجہ کھینچنے میں جٹی ہوئی تھی۔ الڑھ بنی حسینہ کا بیدار سراپا جادو جگانے میں مشغول تھا۔ کمنٹری کے دل آویز اور ہیجان آمیز بول اپنے آہنگ بلند کرنے میں مصروف

تھے۔

مگر اس وقت میرے لیے یہ سب کچھ بے معنی ہوگیا تھا۔ میرے لیے تو وہ تصویر گنجینۂ معانی بن گئی تھی جس کے ابھرتے ہی کمتیں بے معنی ہوگئی تھیں

آب سیلاب بن گیا تھا
پھول انگارے میں تبدیل ہوگیا تھا
بادِصموم باد صرصر میں بدل گئی تھی
آسمان زمین پر آگیا تھا

اب مجھے دیکھنے سننے اور کچھ پانے کے بجائے دکھانے کی جلدی تھی۔ جلدی تھی کہ میں نے اصل کی شناخت کرلی تھی۔ ایک نئی حقیقت دریافت کرلی تھی۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ تصویر میری پتلیوں سے نکل کر لوگوں کی آنکھوں میں پہنچ جائے اور دنیا جان جائے کہ اصل تصویر کیا ہے مگر میڈیا دیر کر رہا تھا۔ کب سے ایک ہی رکارڈ بجا رہا تھا۔

''لگے رہیے۔ موبائل کو کان سے الگ مت کیجیے۔ کبھی بھی آپ کا نمبر آسکتا ہے اور ستر ہزار کی رقم آپ کی جھولی میں جاسکتی ہے۔''

میڈیا کا یہ کھیل شروع میں بہت اچھا لگا تھا۔ اس کھیل کا ایک ایک پہلو دامنِ دل کھینچتا تھا مگر

اب یہ کھیل اکتاہٹ کے ساتھ ساتھ تکلیف دہ بھی ہوتا جا رہا تھا۔ آخر میرا نمبر کیوں نہیں آرہا تھا۔ اس میں اتنی دیر کیوں ہو رہی تھی؟ میں حیران و پریشان تھا کہ میرے ذہن کے ایک گوشے میں ایک خیال کسی کوندے کی طرح لپک اُٹھا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ میڈیا اس کھیل کے ساتھ ساتھ کوئی اور کھیل بھی کھیل رہا ہو؟ اس خیال کے آتے ہی ٹی وی کا اسکرین پھیل کر کافی بڑا ہوگیا اور اس پر ایک بڑے کھیل کی جھلکیا جھلملانے لگیں۔

حکمت

جب وہ بالکل تنہا ہو گیا تو میں اس کے پاس پہنچا اور اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا،

''اب کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''

''جیسے جہنم کے ایک طبق سے نکل کر دوسرے میں پہنچ گیا ہوں۔'' اس نے جلے بھنے لہجے میں جواب دیا۔

''ایسا کیوں؟ آپ تو باعزت بری ہوئے ہیں؟'' میں نے سمجھانے کا انداز اختیار کیا۔

''جی ہاں، کہنے کو تو میں واقعی باعزت بری ہو گیا مگر عزت ایسی اتری کہ داغ نہیں گئے۔ لوگ اس طرح دیکھتے ہیں جیسے چہرے پر ٹھپے لگا دیے گئے ہوں'' میری طرف دیکھ کر اس نے یہ جملہ ادا کیا۔

میں تلملا گیا حالاں کہ میں نے ہمدردانہ نظر ڈالی تھی۔

''میں آپ سے کچھ جاننے آیا تھا، اگر موڈ اچھا نہ ہو تو پھر کبھی آجاؤں گا۔'' میں نے اپنے لہجے کو اور نرم کر لیا۔

''پوچھیے، میں بالکل ٹھیک ہوں،'' اس کے سپاٹ لہجے میں بھی درد کی لہریں موجزن تھیں۔

''میرے زیادہ تر سوالات آپ کی گرفتاری سے متعلق ہوں گے، آپ کو اعتراض

تو نہیں ہوگا؟''

''میرے پاس اس ذلّت کے علاوہ اور ہے بھی کیا؟ آپ بلا تکلف پوچھیے۔''

''شکریہ! آپ کو جب گرفتار کیا گیا تو آپ کو کیسا لگا؟''میں نے سوالوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

''مجھے محسوس ہوا جیسے میں غلط جگہ پیدا ہو گیا۔''

''ایسا کیوں محسوس ہوا؟''

''اس لیے کہ میں کہیں اور پیدا ہوا ہوتا تو میرے ساتھ وہ سلوک نہیں ہوتا جو ہوا۔ مجھے بار بار وہ معصوم اور بے قصور عورت یاد آتی رہی جسے ڈائن بتا کر گاؤں کے بھرے مجمعے میں ننگا نچایا گیا۔

''ذرا تفصیل سے بتائیں گے؟''میں نے درخواست کی۔

ہمارے گاؤں میں ایک عورت تھی۔ نہایت بے باک، ملنسار، پرخلوص اور دردمند، ہر ایک کے دکھ سکھ میں فوراً پہنچ جاتی تھی مگر اس کے اس اعلا انسانی رویے کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا۔ لوگوں کو اس کا خلوص اس کی کوئی چال لگتی۔ شک کی بنیاد شاید یہ بھی تھی کہ اس کے آتے ہی اس کے ساس سسر اور پھر اس کے شوہر تینوں موت کے گھاٹ اتر گئے تھے حالاں کہ وہ تینوں کسی مہاماری کے شکار ہوئے تھے۔ ایک بار کسی بیماری کی ہوا چلی۔ گاؤں کے کئی گھروں کے بچے اس وبا کی لپیٹ میں آ گئے۔ اسے پتا چلا تو وہ بھاگی بھاگی انھیں دیکھنے گئی۔ اتفاق سے بچّوں کی حالت اور بگڑ گئی اور ان میں سے ایک نے دم توڑ دیا۔ پھر کیا تھا الزام اس عورت کے سر منڈھ دیا گیا اور ناکردہ جرم کے پاداش میں اسے ننگا کر کے نچایا گیا۔ وہ بے چاری چیختی چلّاتی اور گڑگڑاتی رہی۔ اپنی بے گناہی پر آنسو بہاتی رہی مگر کسی کو بھی اس پر رحم نہیں آیا۔ وہ لوگ بھی خاموش تماشائی بنے رہے جو یہ سمجھتے تھے کہ بچّے کی موت کا اصل سبب کیا تھا اور وہ عورت واقعی بے قصور تھی۔ صرف ننگا کرنے سے لوگوں کا جی نہیں بھرا، جلتی لکڑی سے اسے داغا بھی گیا اور اس طرح داغا گیا کہ اس کے جسم کی چربی باہر نکل آئی۔۔۔ عورت کا قصّہ بیان کرتے کرتے اچانک اس کی زبان بند

ہوگئی اور آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک پڑے جیسے اس کی پتلیوں میں گرم سلائیاں پھیر دی گئی ہوں۔"

"معاف کیجیے گا میرا مقصد آپ کو رلانا نہیں تھا۔"

"آپ کا مقصد ہو یا نہ ہو، یہ تو میرا مقدر بن چکا ہے۔" رخساروں پر کچھ اور قطرے بھی ڈھلک آئے۔

"آپ کے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا؟"

"اس ڈائن، میرا مطلب ہے اس معصوم عورت سے بھی کہیں زیادہ بدتر۔ ایسا ہولناک کہ اس کے تصور سے بھی روح کانپ اٹھتی ہے۔ کوئی ایسی اذیت نہیں جو مجھے نہ دی گئی ہو۔ ان انگوں کو بھی، جن کی طرف دیکھنا بھی منع ہے، ننگا کر کے ان میں بجلی کا کرنٹ دوڑایا گیا اور یہ عمل کوئی ایک بار نہیں، بلکہ بار بار دہرایا گیا اور ایسے ایسے جھٹکے دیے گئے کہ جاں کنی کا عالم بھی شرما جائے۔" پلکوں پر رکی بوندیں بھی گالوں پر ڈھلک آئیں۔ میرا جی چاہا کہ میں اپنا رومال اس کی طرف بڑھا دوں مگر یہ سوچ کر کہ میرا یہ عمل اس کے زخموں پر کہیں نمک نہ چھڑک دے، میں نے اپنے کو روک لیا۔

"آپ نے کیا کیا کھویا؟" میں جانتا تھا کہ میرے اس سوال پر اور زیادہ آنسو بہیں گے مگر میرے لیے یہ جاننا بھی ضروری تھا۔

اس سوال پر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا:

"یہ پوچھیے کہ کیا نہیں کھویا؟ صدمے سے ماں چل بسی۔ تذلیل آمیز آوازوں، تحقیری روّیوں اور قہر آلود نظروں کی تاب نہ لا کر باپ نے جیتے جی اپنے کمرے کو قبر بنا لیا۔ جنم جنم تک ساتھ نبھانے کا وعدہ کرنے والی محبوبہ کسی اور کی ہوگئی۔ دوست احباب بدگمانی کے شکار ہوگئے۔ پڑوسیوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ عزیز و اقارب دوری بنانے لگے۔ زندگی جو رنگ و نور سے معمور اور خوش خیالی۔۔۔" زبان بند ہوگئی اور آنکھیں سامنے کی دیوار پر پہنچ گئیں۔

دیوار پر عمدہ اور نفیس فریم میں ایک خوبرو نوجوان کی تصویر آویزاں تھی:

سلیقے سے سجے سیاہ بال، صاف ستھری چوڑی چکنی پیشانی، روشن آنکھیں، نظریں کسی نشانے پر جمی ہوئیں، پھولوں کی طرح مسکراتے ہوئے ہونٹ، بھرے بھرے گال، تنی ہوئی جلد، کریز ڈ تھری پیس سوٹ، میچنگ ٹائی۔

''یہ آپ کے بیٹے کی تصویر ہے؟'' میرا یہ سوال سن کر کچھ دیر تک وہ خاموش رہا، پھر بولا۔

''جیل نہیں گیا ہوتا تو شاید میرا بیٹا بھی ایسا ہی اور اسی عمر کا ہوتا۔'' تصویر سے نظریں ہٹا کر اس نے اپنا رخ میری طرف کر لیا۔

''تو کیا یہ آپ ____؟''

''جی،'' جی کی آواز اس طرح نکلی جیسے کسی ادھ مرے جسم سے نکلی ہو

میری آنکھیں پھیل گئیں اور نگاہیں اس کے سراپے میں الجھ گئیں:

روکھے پھیکے بال، سیاہی میں سفیدی کی ملاوٹ، سلوٹوں سے بھری پیشانی، بجھی ہوئی آنکھیں، گڈھے پڑے گال، مرجھائے ہوئے ہونٹ، آنکھوں کے نیچے سیاہ ہالے، گالوں پر جا بجا دھبے، بغیر استری کے کپڑے۔

''اس قید و بند کی سختی سے میرا سراپا تو ڈیمیج ہوا ہی، میری وہ شے بھی شاید کچلی گئی جس سے مرد کی۔۔۔۔'' ہونٹ کپکپا کر بند ہو گئے۔ آنکھیں برس پڑیں۔

''ایک گلاس پانی ملے گا؟'' میں نے پانی سے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی۔

''ضرور'' وہ اندر جا کر جگ اور گلاس اُٹھا لایا۔

''قید و بند کے دنوں میں جس بات نے آپ کو سب سے زیادہ پریشان کیا، وہ کیا تھی؟''

پانی کا خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے میں نے انٹرویو کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔

''وہ ایک سوال تھا۔'' اپنے ہاتھ کا آدھا خالی اور آدھا بھرا گلاس اس نے بھی میز پر رکھ دیا۔

''وہ سوال کیا تھا؟'' میرا تجسس بڑھا گیا۔۔۔۔

''وہ سوال تھا میں گرفتار کیوں ہوا؟ سوتے جاگتے ،اٹھتے بیٹھتے دن رات یہی سوچتا رہا کہ مجھے گرفتار کیوں کیا گیا؟ گرفتاری کے جتنے اسباب ہو سکتے ہیں میں نے سب پر غور کیا۔ایک ایک پہلو پر ٹھہر ٹھہر کر سوچا مگر کوئی بھی میرا عمل ایسا نظر نہیں آیا جو میری گرفتاری کا سبب بنتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے کوئی بھی ایسا کام نہیں کیا تھا جس کے باعث میری طرف کوئی انگلی بھی اٹھا سکے۔ پہلی کلاس سے لے کر آخری کلاس تک میرا کریر اور کریکٹر بے داغ رہا۔ محلّے سے لے کر کالج تک کسی سے بھی میری کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔ میں پڑھنے میں سنسیئر تھا اور ایسی کارکردگی کا مظاہرہ کرتا تھا کہ سالانہ فنکشن میں سب سے زیادہ انعامات میری ہی جھولی میں پڑتے تھے۔اسی لیے اساتذہ بھی مجھے عزیز رکھتے تھے۔ میرا کوئی دشمن نہیں تھا، سبھی سے میرے مراسم اچھے تھے۔ جانے انجانے میں بھی کبھی کسی کو مجھ سے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

''پھر آپ کو ایسے سنگین جرم میں کیوں پکڑ لیا گیا؟''

''یہی تو میری حیرانی ہے۔''

''آپ نے غور تو کیا ہوگا؟''

''جی ہاں، کیا۔''

''کسی نتیجے پر پہنچے؟''

''کچھ عکس ابھرے تو مگر کوئی واضح تصویر نہ بن سکی۔''

''جیسے؟''

''اپنی گرفتاری کے سوال پر غور کرتے وقت ان گرفتاریوں کی روداد میرے کانوں میں گونجتی رہی جن کے ملزم میری ہی طرح ثبوت نہ ہونے کی بنا پر بری کر دیے گئے۔ ہر ایک روداد میں یہ بات بھی سنائی پڑی کہ گرفتار ہونے والا کسی کالج یا انسٹی ٹیوٹ کا کوئی برائٹ اسٹوڈینٹ تھا۔کوئی میڈیکل کے کسی شعبے میں تھا تو کوئی انجینئرنگ کی کسی برانچ میں۔کوئی کسی کمپنی میں منیجر تھا تو کوئی کسی فیکٹری میں انجینئر،کوئی کسی رسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اسکالر تھا تو کوئی کسی کمپنی یا آفس کا کوئی اچھی پوسٹ ہولڈر امپلائی،کوئی نیوز پیپر میں رپوٹر تو کوئی کسی

ٹی۔وی چینل کا کمپیئر، کوئی کمپیوٹر کا ماہر تھا تو کوئی کسی ٹیکنولوجی کا اکسپرٹ۔ سب کے سب جوان بھی تھے۔ کوئی بھی ان میں بوڑھا نہیں تھا۔

ایک عکس یہ بھی ابھرا کہ جس انداز سے میری گرفتاری ہوئی اور جتنی جلدی میرے خلاف ثبوت جٹا لیے گئے اور جس طرح ان ثبوتوں کی جانچ پڑتال کیے بغیر مجھے جیل میں ڈال دیا گیا اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ جیسے پہلے سے یہ منصوبہ تیار ہو کہ اگر میرے علاقے میں ایسا کچھ ہوتا ہے جس سے بدامنی پھیلتی ہے یا افراتفری پھیلنے کا خدشہ ہو تو مجھے گرفتار کر لیا جائے۔ میرے اس اندیشے کو تقویت اس نوعیت کی بعض دوسری گرفتاریوں سے بھی ملتی ہے۔

''اگر آپ کے ان شبہات کو اہمیت دی جائے تب بھی سوال قائم رہتا ہے کہ کیوں؟''

''شاید اس کیوں کا جواب میرا نام ہو؟''

''آپ کا نام کیوں؟''

''اس لیے کہ میرا نام ایسا ہے کہ جس کے کانوں میں پڑتے ہی کچھ لوگوں کی آنکھوں میں خوفناک مناظر لہرا اٹھتے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''سمجھا تو ٹھیک سے میں بھی نہیں مگر لگتا ہے کہ ایسا ہوتا ہوگا۔''

''ایسا کیوں لگتا ہے؟''

''شاید اس لیے کہ میرا نام جس لسانی مآخذ سے آیا ہے اور اس مآخذ سے اتنے سارے قصّے جڑے ہیں اور ان قصّوں میں ایسے ایسے وقوعے گڑھے گئے ہیں اور پلاٹ میں ایسے ایسے مرقعے بنائے گئے ہیں کہ ان کے اثرات لگتا ہے انفرادی لاشعور کے ساتھ ساتھ اجتماعی لاشعور میں بھی مرتب ہو چکے ہیں۔''

''اگر اس کو بھی سچ مان لیا جائے تب بھی اس سے کہاں ثابت ہوتا ہے کہ جو کچھ ہوا اس کا قصوروار ایک مخصوص لسانی مآخذ سے تعلق رکھنے والا نام ہی ہے؟''

''ثابت تو نہیں ہوتا مگر شک کی سوئی اُدھر جاتی ضرور ہے۔''

''صرف شک کی بنیاد پر اتنا بڑا فیصلہ! میری عقل تو اسے ماننے کے لیے تیار نہیں۔''

''عقل تو شاید ان کی بھی تسلیم نہیں کرتی ہوگی جن کے ہاتھوں گرفتاریاں عمل میں لائی جاتی ہیں''

''پھر یہ گرفتاری ہوئی کیوں؟'' گھوم پھر کر ہم پھر اسی سوال پر آ گئے۔

''یعنی آپ کو بھی لگتا ہے کہ میری گرفتاری بلاوجہ ہوئی؟ یا کم سے کم ان میں سے کوئی وجہ نہیں جس کی بنیاد پر میری گرفتاری کی منطق سمجھ میں آتی؟'' اس نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا

''آف کورس۔ آپ کی رہائی اس بات کا ثبوت ہے کہ گرفتاری بلاوجہ ہوئی مگر بلاوجہ کی اس گرفتاری کی منطق میری سمجھ سے باہر ہے۔'' میں نے اپنی بات صاف صاف کہہ دی۔

''میں نے بتایا نہ کہ اس کی وجہ شاید میرا نام ہے۔'' وہ اپنے شبہے پر زور دینے لگا۔

''آپ اتنے وثوق کے ساتھ اپنے شک کی وکالت کیوں کر کر سکتے ہیں؟''

''اس کی ایک منطق کی طرف تو میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں کہ میرا نام ایسا ہے کہ جس کے کانوں میں پڑتے ہی کچھ آنکھوں میں خوف ناک منظر لہرانے لگتے ہیں اور دوسری منطق یہ ہے کہ میرے نام سے کچھ لوگوں کی ناکامیاں چھپ جاتی ہیں اور مشاہدہ یہ بھی بتاتا ہے کہ کچھ لوگ آسانی سے اس کی بدولت سُرخ روئی بھی حاصل کر لیتے ہیں۔''

''چلیے مان لیا کہ سبب آپ کا نام ہے مگر آپ کے نام تک پہنچنے کے لیے بھی تو کوئی آدھار ہونا چاہیے۔ یا یوں ہی کوئی آنکھیں بند کر کے آپ تک پہنچ جائے گا۔ یہ کوئی آنکھ مچولی کا کھیل تھوڑے ہی ہے!''

''جس انداز سے میری گفتاری ہوئی اس سے تو یہی لگتا ہے کہ آنکھ مچولی والا ہی کھیل ہوا ہے۔ پکڑنے والا آنکھیں بند کر کے ہی مجھ تک پہنچا تھا۔ آنکھیں ہوتیں تو یقیناً اس کے ہاتھ مجھ تک نہیں پہنچتے۔''

''اگر ایسا ہوا بھی ہے تو اس کی بھی تو کوئی وجہ ہوگی؟''

''جی ہاں، وجہ تو ہوگی۔''

''کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

''جہاں تک میں نے سوچا ہے اس کی وجہ وہ روبو سسٹم ہے جس کے ذریعے اس طرح کی گرفتاریاں عمل میں لائی گئی ہیں یا لائی جا رہی ہیں۔''

''ذرا کھل کر بتایئے نا۔'' میں نے وضاحت چاہی۔

''وہ عملہ جس کے ذمے یہ کام سونپا گیا ہے، مجھے لگتا ہے کہ وہ روبو سسٹم سے عمل کرتا ہے۔ اس کے پاس کوئی اپنی سمجھ نہیں ہے، وہ اپنی کسی بھی حس کا استعمال نہیں کرتا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کے پاس حواس ہیں ہی نہیں۔ جس طرح سے روبوٹ Computerised System کے مطابق کام کرتا ہے، وہ بھی ویسا ہی ایکٹ کرتا ہے۔ اسے کیا کرنا ہے؟ کس سمت میں جانا ہے؟ کہاں تک جانا ہے؟ کہاں سے کدھر مڑنا ہے؟ کس کو دائرے میں لانا ہے؟ کسے دائرے سے باہر رکھنا ہے؟ کس کو چھوڑنا ہے اور کسے دھر دبوچنا ہے؟ یہ سب کچھ اس میں پہلے سے feed کر دیا گیا ہے، اسی لیے عملہ بدل جانے کے بعد بھی عمل ویسا ہی رہتا ہے۔ آپ غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ ہر ایک رزیم (Regime) میں نتیجہ وہی نکلتا ہے۔ دھما کا کہیں بھی ہو؟ کیسا بھی ہو؟ پکڑ میں وہی آتے ہیں جنھیں آنا ہے۔ ثبوت نہ ہونے کے باوجود وہ پکڑ لیے جاتے ہیں اور پختہ ثبوت ہونے کے باوجود اصل مجرم پکڑ میں نہیں آتے۔ ربوٹ کی طرح اس پر بھی آنسو، آہ اور کراہ کا اثر نہیں ہوتا۔

''چلیے یہ بھی مان لیا کہ یہ کام روبوٹ سسٹم کے ذریعے ہوتا ہے مگر پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر یہ سسٹم بنا کیوں؟''

''شاید اس لیے بنا ہو کہ اس کے بنانے والے دور اندیش رہے ہوں۔ ان کی نظریں ماضی اور حال کے ساتھ ساتھ مستقبل پر بھی رہی ہوں۔ انھیں یہ علم ہو کہ آنے والا وقت اپنے ساتھ کیا کیا لا سکتا ہے؟ اس کے آنے پر کیا کیا ہو سکتا ہے؟ کس کس طرح کی

صورتِ حال پیدا ہوسکتی ہے؟ وہ صورتِ حال کیا کیا رنگ دکھا سکتی ہے؟ کون کدھر جا سکتا ہے؟ کون کہاں آ سکتا ہے؟ کون آگے بڑھ سکتا ہے؟ کون پیچھے چھوٹ سکتا ہے؟ خود کو کیسے بچایا جا سکتا ہے؟ دوسروں کو کیسے پھنسایا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔

''آپ کو یہ نہیں لگتا کہ آپ کی باتیں کچھ زیادہ ہی فلسفیانہ ہو رہی ہیں۔ لگتا ہے مسلسل غور و فکر کی عادت نے آپ کو فلسفی بنا دیا ہے۔''

''ممکن ہے ایسا آپ کو لگتا ہو ورنہ سچ تو یہی ہے کہ میرے شبہات میرے برسوں کے مشاہدات و محسوسات پر مبنی ہیں۔''

''آپ کتنے سال تک رہے؟''

''شاید بارہ یا تیرہ یا شاید۔۔۔۔۔''

''آپ کو جب گرفتار کیا گیا اس وقت آپ کی عمر کیا رہی ہوگی؟'' میں نے calculation کو آسان بنانے کی کوشش کی۔

''میں بیس سال کا تھا۔''

''کالج میں ہوں گے؟''

''جی۔''

''سبجیکٹ کیا تھا؟''

''سائنس۔''

''کوئی خاص وجہ؟''

''سائنس میں میری دلچسپی بہت تھی۔ سائنس دانوں کے تجربوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ کئی تجربے میں نے بھی کیے تھے۔ ان میں کچھ تو ایسے تھے جنھیں دیکھ کر میرے اساتذہ کہا کرتے تھے کہ آگے چل کر سائنس کے میدان میں میں نام پیدا کروں گا۔ اسی لیے بعض اساتذہ میری طرف خصوصی توجہ بھی فرماتے تھے۔''

''اب آپ کی عمر کیا ہے؟''

''چوتیس سال۔''

''گویا چودہ سال تک آپ قید و بند میں رہے۔ یہ مدّت تو شری رام کے بن باس کی نکلی!''

''جی ہاں، اور کیا پتا میری گرفتاری کا مقصد بھی وہی نکلے۔

''مطلب؟'' میری آنکھیں پھیل گئیں۔''

''مطلب وہی جو رام کے بن باس کا مقصد تھا۔''

دفعتاً میری آنکھوں میں راجا دسرتھ کے رتھ سے لے کر کیکئی کے بر، رام کے بن باس اور بھرت کی گدّی نشینی تک کے مناظر ابھر آئے۔ رفتہ رفتہ ان میں اس کے کچھ بیانات بھی پس منظر کے طور پر کھڑے ہوتے گئے۔

''بے حد شکریہ کہ آپ نے میرے لیے وقت نکالا اور میرے سوالوں کا جی کھول کر جواب دیا۔ اب اجازت۔'' ایک بار پھر اس کی طرف نظر ڈال کر میں اٹھنے لگا۔ اس بار کا میرا دیکھنا اسے ایسا محسوس نہیں ہوا جیسا کہ اسے پہلی بار محسوس ہوا تھا۔

''آپ کا بھی شکریہ کہ آپ نے مجھے ہمدردی سے سنا۔'' اس جملے کے ساتھ اس کے آنسو بھی باہر آ گئے۔ اس بار بلا کسی جھجھک کے میں نے اپنا رومال اس کی جانب بڑھا دیا۔

'انٹرویو' میں نے اخبار کو اشاعت کے لیے بھیج دیا مگر جب وہ چھپ کر آیا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ اس کے کچھ حصّے حذف کر دیے گئے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کا بیان کیا ہوا ربوسٹم والا ''شبہ'' شاید بے بنیاد نہیں تھا۔

میسیج الرٹ ٹون

بلند بالا عمارت میں آج پھر سنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ عمارت کچھ اور اونچی ہو جائے۔ اتنی اونچی کہ آس پاس کی کچھ بلند عمارتوں کے برابر پہنچ جائے اور کچھ سے اوپر نکل جائے۔

''مسٹر پرکاش! آپ تو Creative Imaginative ہیں، آپ کچھ ایسا سوچیے کہ جس کے کرنے میں بزنس تو بڑھے ہی، مزہ بھی آئے۔ کام کے ساتھ ہمارا نام بھی چمکے۔''

کمپنی کے ایم ڈی مسٹر جی پی اگروال نے پروڈکشن منیجر چندر پرکاش کو مخاطب کیا۔

''ایم ڈی صاحب کا یہ بجھاؤ کافی اچھا ہے۔ ہمیں بھی کچھ نیا کرنا چاہیے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی نے بزنس کی دنیا میں ایک انقلاب لا دیا ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی دھماکہ ہوتا رہتا ہے۔ ہمیں بھی اس میدان میں کوئی دھماکہ کرنا چاہیے۔ پرکاش جی! اس کام کے لیے آپ بہت ہی مناسب آدمی ہیں۔ آپ کا دماغ ایسے کاموں میں بہت چلتا ہے۔ آپ کو اس طرف گمبھیرتا سے سوچنا چاہیے۔''

چندر پرکاش کے منہ کھولنے سے پہلے ہی کمپنی کے صلاح کار مسٹر ایم سی چوپڑا بول پڑے۔

''آپ لوگ درست فرما رہے ہیں۔ میں ضرور سوچوں گا۔'' چندر پرکاش کا

فلسفیانہ چہرہ اور بھی سنجیدہ ہو گیا۔

مینجنگ بورڈ کی میٹنگ اس نتیجے پر برخاست ہوئی کہ مسٹر چندر پرکاش دو ہفتے کے اندر اندر بورڈ کے سامنے کوئی ٹھوس منصوبہ پیش کریں گے۔

بورڈ کے دباؤ اور کچھ نیا کرنے کے خیال نے چندر پرکاش کو مراقبے میں بٹھانا شروع کر دیا۔

ان کے مراقبے میں آسمان کو چھونے والی عمارتیں، عمارتوں کے درمیان کی رسہ کشی، اوپر نیچے کی کشمکش، ان کے اندر ہونے والی سرگرمیاں، سرگرمیوں کے نتائج، ان کے اثرات، ان عمارتوں سے جڑے قریب اور دور کے گھر، گھروں کے در، گھروں میں بسنے والے مکینوں کے دل و دماغ، چشم و لب سبھی کھلنے لگے۔ باہر اندر دونوں سمتوں کا منظر سامنے آنے لگا۔

ایک دن چندر پرکاش مراقبے کے منظروں اور منظروں کے پیش منظروں میں کھوئے ہوئے تھے کہ ان کے موبائل پر میسیج الرٹ ٹون بجی۔ موبائل اٹھا کر اس کے اسکرین پر انھوں نے اپنی نظریں جما دیں۔

فری رنگ ٹون۔ ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔ میوزک اسٹیشن۔

گانے سنیے ساتھ میں رنگ ٹون بالکل فری Rs1/m-@اور -/Rs.19 منتھ ونلی۔ سینڈر، بی پی۔ 1263003۔

چندر پرکاش کی نگاہیں اس میسیج پر دیر تک مرکوز رہیں۔ اس تحریر میں کوئی خاص بات نہیں تھی مگر اس کے اندر سے ایک ایسا پیغام ابھر رہا تھا جو چندر پرکاش کی فکر کی سمت متعین کرنے میں روشنی کا کام انجام دے رہا تھا۔ اس پیغام سے ایسی روشنی ابھری کہ دفعتاً چندر پرکاش کی آنکھوں میں کچھ چہرے ابھر آئے۔ ایسے چہرے جو اداسی، مایوسی، پژمردگی، بے کیفی اور اضطراب سے معمور تھے۔ جن کی آنکھوں میں ویرانیوں کا سمندر موجزن تھا اور اس سمندر میں سینے کی گھٹن اور دل کی بے کلی ہلکورے مار رہی تھی۔

مایوس، پژمردہ اور مضطرب چہروں کے اس دلدوز اور تکلیف دہ منظر نے تخلیق کار چندر پرکاش کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ان کی تخلیقی قوتیں یکا یک جوش میں آ گئیں۔ انھوں نے قلم اور کاغذ اٹھالیا۔

کچھ جملوں کے بعد قلم رک گیا۔ انھوں نے ان جملوں کو پڑھا۔ پڑھ کر اس کاغذ کو گولا بنایا اور اس گولے کو زمین پر لڑھکا دیا۔

پھر ایک کاغذ اٹھایا۔ اس پر بھی کچھ لکھا۔ اسے بھی پڑھا۔ پھر اس کاغذ کو بھی گولا بنا کر نیچے پھینک دیا۔

اسی طرح باری باری سے وہ کاغذ اٹھاتے گئے۔ ہر ایک کاغذ پر کچھ نہ کچھ لکھ کر اسے بھی گولا بنا کر زمین پر لڑھکاتے گئے۔

یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد ایک کاغذ کی قسمت جاگی اور وہ گولا بننے اور نیچے لڑھکنے سے بچ گیا۔

ان کی نظریں اس کاغذ پر ابھری تحریر کو بار بار پڑھتی رہیں اور ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی رہی۔ آخری بار جب انھوں نے اس پر نظر ڈالی تو وہ تحریر بھی چمک اٹھی:

''کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے چہرے سے اداسی مٹ جائے، مایوسی دور ہو جائے، پژمردگی کی جگہ شگفتگی آ جائے، آنکھوں میں نور بھر جائے، سینے کا اضطراب ٹھہر جائے۔ رگوں میں کیف وانبساط کی لہریں دوڑنے لگیں۔ آپ کی گھٹن کم ہو جائے۔ آپ کا بھاری پن غائب ہو جائے اور آپ پھول کی طرح ہلکے ہو جائیں تو ہم سے رابطہ قائم کیجیے۔09873899260۔''

چندر پرکاش نے اپنا موبائل اٹھایا۔ اسے آن کیا۔ اسکرین روشن ہو گئی۔ اسکرین کے روشن ہوتے ہی ان کے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا اسکرین کے نیچے بنے بٹنوں پر تیزی سے پھرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سادہ اسکرین تحریر سے بھر گئی۔

کچھ دیر بعد انگوٹھا پھر سے موبائل کے بٹنوں پر پہنچ گیا۔ اس بار اسکرین پر حروف

کی جگہ کچھ نمبر ابھرے۔ نمبروں کے ابھرتے ہی انگوٹھے نے لپک کر ایک اور بٹن دبا دیا اور آن کی آن میں تحریر اسکرین سے نکل کر کہیں اور پہنچ گئی۔

اس عمل کے بعد چندر پرکاش کچھ بے چین سے نظر آنے لگے۔ ان کی نظریں اسکرین پر اس طرح جم گئیں جیسے وہاں پر عید کا چاند طلوع ہونے والا ہو یا کوئی دھماکہ ہونے والا ہو۔

کچھ دیر بعد موبائل پر میسیج الرٹ ٹون بجی تو ان کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ انگوٹھا فوراً اس بٹن پر پہنچ گیا جس کے دبتے ہی سادہ اسکرین تحریر سے بھر گئی۔

تحریر پڑھ کر چندر پرکاش کی گھبراہٹ دور ہوگئی اور ان کی آنکھیں ایک بار پھر چمک اٹھیں۔ یہ چمک پہلی چمک سے زیادہ روشن اور تابناک تھی۔

ان کی نگاہیں دیر تک اس تحریر پر جمی رہیں اور آنکھوں کی چمک گہری ہوتی گئی۔ آنکھوں کے ساتھ ساتھ ان کی پیشانی بھی چمکنے لگی۔

ایک لمحے کے لیے آنکھوں میں کسی سوچ کا پرچم لہرایا اور انگوٹھا موبائل کے بٹنوں پر پہنچ کر رقص کرنے لگا۔

انگوٹھے کا جب رقص تھما اور موبائل نے کچھ دم لیا تو موبائل پر ایک میسیج الرٹ ٹون بجی۔ تھوڑی دیر بعد دوسری ٹون بجی۔ پھر تیسری اور پھر بار بار بجنے لگی۔

میسیج الرٹ ٹونوں کا سلسلہ تھم گیا تو چندر پرکاش نے موبائل اٹھا کر باری باری سے ان تحریروں کو پڑھنا شروع کر دیا جو ان کے انگوٹھے کے رقص کے جواب میں داد کے طور پر ابھری تھیں۔

ان تحریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کو ان تدبیروں کا بے صبری سے انتظار ہے جو ان کے اضطراب اور گھٹن کو دور کر سکتی ہیں دل و دماغ سے بوجھ اتار کر انھیں ہلکا کر سکتی ہیں۔ انھیں شگفتہ بنا سکتی ہیں۔

اب جو چیز چندر پرکاش کو پریشان کر رہی تھی وہ اس تدبیر کی تلاش تھی جو جادو کا سا

کام کرے۔ جس کی چھومنتر سے بے چینیاں اڑن چھو ہو جائیں۔

چندر پرکاش موبائل سے ہٹ کر ایک بار پھر سے مراقبے میں پہنچ گئے۔ گردوپیش کی دنیا ان کے دیدوں میں سمٹ آئی۔ نظریں ان لوگوں کے دلوں کو ٹٹولنے لگیں جو اداس چہرہ لیے دفتروں میں جانے کس سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں۔ اپنے بھرے پرے گھروں میں بھی بے کیف اور مضطرب نظر آتے ہیں۔ اپنے بستر پر لیٹے ہوئے اپنی انگلیوں سے اپنی کنپٹی دبائے رہتے ہیں۔ بھیڑ میں رہ کر بھی تنہائی کی اذیتوں سے دور چار رہتے ہیں۔ شریکِ سفر کی موجودگی میں بھی زندگی کے سفر کی لذتوں سے محروم رہتے ہیں۔

مراقبے میں انھیں یہ بھی نظر آیا کہ کہاں کس چیز کی کمی ہے؟ کسے کس چیز کی ضرورت ہے؟ کس درد کی کیا نوعیت ہے؟ مراقبے نے اس تدبیر کی طرف اشارہ بھی کیا جو لوگوں کے دکھ درد کا درماں بن سکتی ہے۔ اشارہ ملتے ہی چندر پرکاش کی آنکھیں ایک بار پھر چمک اٹھیں۔ جیسے سرسراہٹ کے ساتھ جادو کا کوئی منتر ان کے سامنے ابھر آیا ہو۔

وہ فوراً اپنی میز پر پہنچے۔ کاغذ قلم اٹھایا اور مراقبے میں ملا اشارہ تدبیر میں ڈھلنے لگا!

''میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ کے اندر کوئی ایسا خلا گھر کر گیا ہے جو آپ کو کھوکھلا کرتا جا رہا ہے۔ ضرورت ہے آپ کو ایک ایسے ساتھی کی جو آپ کے خلا کو بھر سکے، آپ کو کھوکھلا ہونے سے بچا سکے۔ مجھے آپ کا کرب بہت بے چین کرتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں آپ کا سارا کرب پی جاؤں۔ آپ کو اتنا پیار دوں کہ آپ سمیٹنا چاہیں تو حوصلے کا دامن بھی تنگ ہو جائے۔''

''میں نے آپ کو دیکھا تو نہیں ہے مگر آپ کی آواز کی شیرینی، لہجے کی نرمی، باتوں کی گہرائی اور اندازِ تخاطب کی اپنائیت بتاتی ہے کہ آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ سے بات کر کے طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے۔ رگوں میں خوشی کی ترنگیں بھر جاتی ہیں۔ اداسی چھٹ جاتی ہے، بے دلی دور ہو جاتی ہے اور جینے کی امنگ سی پیدا ہو جاتی ہے۔''

''آنکھیں بند کیں تو آپ کا چہرہ دیدوں مین آبسا۔ ایسا خوبصورت اور شگفتہ چہرہ

بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ دیر تک میری نظریں آپ کو نہارتی رہیں۔ رنگوں سے محظوظ ہوتی رہیں۔ شادابیوں کو اپنے اندر اتارتی رہیں اور میرا دل آپ کو دعائیں دیتا رہا کہ آپ نے اپنے چہرے کو میری آنکھوں میں آنے کی اجازت دی اور یہ تمنا کرتا رہا کہ یہ چہرہ بار بار میری آنکھوں میں آتا رہے۔ اپنے جلووں سے میرے دل کے نہاں خانوں کو سجاتا رہے۔''

چندر پرکاش نے اپنے مراقبے کے مشاہدات وعمل کی روشنی میں ایک لائحہ عمل تیار کیا اور تفصیل کے ساتھ بورڈ کے سامنے پیش کر دیا۔

بورڈ کو ان کا منصوبہ اور اس کا استفسار اتنا پسند آیا کہ اس نے اس پر فوراً عمل کرنے کی منظوری دے دی۔ جلد ہی اس پر عمل بھی شروع ہو گیا۔

ہدایت کے مطابق مختلف کمیٹیاں بنائی گئیں۔ معلومات کمیٹی کو مختلف شہروں کی ٹیلی فون ڈائریکٹری سونپی گئی اور یہ ہدایت دی گئی کہ وہ کچھ ایسے نمبروں کی فہرست تیار کرے جن کے مالکوں کے متعلق کچھ ضروری تفصیلات آسانی سے معلوم ہو سکیں۔ تفصیلات میں یہ جانکاری ضرور ہو کہ صاحب نمبر کی عمر اور حیثیت کیا ہے اور اس کی ازدواجی زندگی کیسی ہے؟

حسب ہدایت ایک تخلیق کمیٹی بھی تشکیل دی گئی اور اس کے لیے بہت سارے تخلیق کاروں کا انتخاب کیا گیا۔ خصوصاً ایسے تخلیق کاروں کا جو تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ خط و کتابت کے فن میں بھی ماہر تھے اور جنھیں انشا پردازی میں ملکہ حاصل تھا اور جو اپنی تحریروں سے رلانے، گدگدانے اور ہنسانے کا ہنر جانتے تھے۔

اس تخلیق کمیٹی کو ہدایت دی گئی کہ وہ معلومات کمیٹی کی فراہم کردہ تفصیلات کی روشنی میں مختلف طرح کے لوگوں کی ضرورتوں کے پیش نظر کچھ ایسی عبارتیں تخلیق کرے جو جادو کا سا کام کریں۔ جو بالکل تیر بہدف ہوں، جن میں وہی اثر ہو جو نیند کی گولیوں میں ہوتا ہے۔ جو ویسا ہی کام کر سکیں جو بدہضمی میں Eno دست میں نورفلوکس، بخار میں پیراسیٹامول اور درد میں کامپوز کام کرتا ہے اور جن میں وہ تاثیر بھی ہو جو ہومیوں پیتھک کی گولیوں میں ہوا کرتی ہے جو آہستہ آہستہ گھلتی ہیں مگر بیماری کو ہمیشہ کے لیے گھلا دیتی ہیں۔ نمونے کے طور پر

چندر پرکاش کی تخلیق کردہ کچھ تحریریں بھی اس کمیٹی کے سامنے رکھ دی گئیں۔

تخلیق کمیٹی نے معلومات کمیٹی کی فراہم کردہ سوانحی تفصیلات اوران سے متعلق نمبروں کے پیش نظر کچھ تحریریں تخلیق کیں اورانھیں لوگوں کے حالات،ضروریات اورنفسیات کے مطابق متعددنمبروں پرS.M.S کردیا گیا۔

ان تحریروں کے جواب میں توقع سے زیادہ تحریریں موصول ہوئیں۔ جوابی تحریروں کی روشنی میں ڈھیر ساری تحریریں تخلیق کی گئیں اوران کی ترسیل وابلاغ کے لیے ایک ایسا پروگرام مرتب کیا گیا جس نے انسانی رشتوں کے درمیان ایک انقلاب برپا کردیا۔اس خبر رسانی کے لیے ایسی نیٹ ورکنگ کی گئی کہ اجنبیوں کے درمیان رابطے بننے لگے۔دوردراز کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آنے لگے۔مردعورتوں سے رشتے بنانے لگے،عورتیں غیرمردوں سے ناطہ جوڑنے لگیں۔دلوں سے دل ملنے لگے،حجابات اٹھنے لگے، تکلفات گھٹنے لگے،تعلقات بڑھنے لگے،نئے رشتے تیزی سے مضبوط ہونے لگے۔

تخلیق کمیٹی نے انے تمام ترتخلیقی قوتوں کواس کام پرلگادیا۔قوت احساس اپنی شدت دکھانے لگی۔متخیلہ بڑھ چڑھ کرحصہ لینے لگی۔احساس کی شدت اورتخئیل کی رنگ آمیزی دونوں نے مل کرتحریروں میں جادو پھونکنا شروع کردیااورجادوسرچڑھ کربولنے لگا۔

اس نئے ترسیلی رشتے میں لوگ تیزی سے بندھنے لگے۔کمپنی کی عمارت آسمان کو چھونے لگی۔

چندر پرکاش اپنی اس نئی مہم کی کامیابی پر بہت خوش تھے۔اس سے ان کا تاجرانہ دماغ اورفنکارانہ دل دونوں مطمئن تھے۔بزنس میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کی اس سکیم سے بے شمارلوگوں کے مضطرب دل ودماغ کواطمینان وسکون بھی حاصل ہورہا تھا۔

مگرایک دن چندر پرکاش نے ایک موبائل سیٹ پرایک ایسا ایس ایم ایس ریسیوکیا کہ اسے پڑھتے ہی وہ ایک دم سے گم سم ہوگئے جیسے انھیں لقوہ مارگیا ہو۔

وہ تحریرویسی ہی تھی جس کے نمونے خود چندر پرکاش اوران کی تخلیق کمیٹی نے تیار

کیے تھے اور جنھیں مختلف فون نمبروں پر بھیجا گیا تھا اور جس کے جواب میں ویسی ہی اور کچھ ان سے بھی زیادہ پراثر تحریریں موصول ہوئی تھیں اور جنھوں نے دلوں میں ایک انقلاب برپا کردیا تھا۔

آج وہ انقلاب خود ان کے اندر در آیا تھا۔ یہ ایسا انقلاب تھا جس نے چندر پرکاش کو اوپر سے ساکت اور اندر سے کافی متغیر کردیا تھا۔

اس تحریر نے ان کے وجود کو یک لخت بے معنی کر کے رکھ دیا تھا۔ اس نے اس رشتے کو جسے انھوں نے برسوں تک اپنے خون سے سینچا تھا، آج پانی کردیا تھا۔ اس نے ان کے خلوص، محبت، وفا، ایثار سب کو بہا دیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان اب کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

دراصل جس موبائل پر انھوں نے ایس ایم ایس پڑھا تھا وہ ان کی بیوی کا سیٹ تھا جسے غلطی سے انھوں نے اپنا موبائل سیٹ سمجھ کر کھول لیا تھا۔ اس غلط فہمی کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے بالکل اپنے ہی جیسا ایک سیٹ اپنی بیوی کو اپنی شادی کی اکیسویں سالگرہ پر تحفے میں پیش کیا تھا۔

اور بٹن کے دبتے ہی وہ تحریر ابھر آئی تھی جسے کسی نے ان کی بیوی کے کسی ایس ایم ایس کے جواب میں تحریر کی تھی۔

اندر کے طوفان نے حساس اور فنکار چندر پرکاش کے دل و دماغ میں ایسی ہلچل مچائی کہ ان کے جسم کا ریشہ ریشہ غیظ و غضب سے بھر اٹھا۔ یہ ایسی ہلچل تھی کہ عزیز ترین شے بھی راہ میں آجائے تو وہ بھی لہروں کے وار سے نہ بچ پائے مگر تاجر اور ٹیکنیکل چندر پرکاش نے فنکار چندر پرکاش کے غیظ و غضب کو سنبھالیا۔ انھیں روک کر ان کے ذہن کو منطقی داؤ پیچ میں الجھالیا:

''چندر پرکاش! مانا کہ تم نے اس رشتے کو محبت اور خلوص سے سینچا ہے۔ اس کی استواری و پائداری کے لیے قربانیاں دی ہیں، وفائیں کی ہیں، دکھ درد بانٹے ہیں، خوشیاں نچھاور کی ہیں، ناز و نخرے اٹھائے ہیں، چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھا ہے۔ تمام ضرور

تیس پوری کی ہیں۔ اپنے مردانہ وقار اور انکار کو بھی قابو میں رکھا ہے مگر ان سب کے باوجود اتنے سالوں کی رفاقت کو چھوڑ کر اگر کوئی کسی اور سے رشتہ جوڑتا ہے تو کوئی بات تو ضرور ہوگی۔ کچھ تو کمی اسے محسوس ہوتی ہوگی۔ کچھ تو وہ ایسا ضرور چاہ رہا ہوگا جسے تم نہیں دے پا رہے ہوگے یا اسے تم سے نہیں مل پا رہا ہوگا یا جس کا تمھارے پاس فقدان ہوگا۔ اس لیے طیش میں آنے اور جذباتیت کی رو میں آکر اس کی ضرب سے بکھر جانے کے بجائے تم میری طرح سوچو۔ یعنی تخلیق کار کے بجائے ایک صنعت کار بلکہ ایک تاجر کی مانند سوچو۔ گرم ہونے کے بجائے نرم ہوکر یہ سوچو کہ اس سانحے کا سبب کیا ہوسکتا ہے اور اس نقصان کی بھرپائی کیسے کی جاسکتی ہے؟ اس سے رشتوں کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کی نفسیات کو بھی سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

میں آپ کی اس بات کو مانتا ہوں کہ یوں ہی کوئی کسی رشتے کو ختم نہیں کرتا۔ ضرور کوئی بڑی بات اس کے پیچھے ہوسکتی ہے۔ میرے ساتھ ساتھ جو کچھ ہوا ہے یقیناً اس کا کوئی سبب ہوگا مگر مجھے دکھ صرف اس بات کا نہیں ہے کہ میرا برسوں کا بسا بسایا گھر اجڑ گیا بلکہ غم اس بات کا بھی ہے کہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہناتے وقت ہم یہ نہ دیکھ سکے کہ اس سے ایک طرف جہاں گھٹن کم ہوسکتی ہے وہیں دوسری جانب اضطراب بڑھ بھی سکتا ہے۔ کہیں اس سے نیا رشتہ بن سکتا ہے تو کہیں پرانا رشتہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔

چندر پرکاش! یہ سچ ہے کہ ہم نے دوسری طرف نہیں دیکھا لیکن میرے بھائی! یہ بھی سچ ہے کہ اگر ہم دیکھتے تب بھی اس رشتے کو ٹوٹنے سے بچا نہیں پاتے۔ اس لیے کہ جہاں جہاں بھی نیا رشتہ بنا ہے، پرانا رشتہ نیا رشتہ بننے کے بعد نہیں ٹوٹا ہے بلکہ وہ پہلے ہی سے ٹوٹا ہوا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ دکھائی وہ بعد میں پڑا۔ یہ جو نیا رشتہ تیزی سے بن رہا ہے۔ رپورٹ بتاتی ہے کہ اس رشتے میں بندھنے والے صرف وہی لوگ نہیں ہیں جن پر تمھاری اور ہماری تخلیق کمیٹی کی تحریروں کا جادو آسانی سے چل گیا ہے اور جو پہلے سے کسی مضبوط گھیرے میں قید نہیں تھے بلکہ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو خاصے مذہبی ہیں۔

سنسکاروں میں پلے بڑھے ہیں۔ قاعدے قانون کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ جو معاشی اعتبار سے خوش حال اور سماجی اعتبار سے صاحب اختیار ہیں۔ جن کی بیویاں خوبصورت اور پرکشش ہیں اور جن کے شوہر تندرست اور اسمارٹ ہیں، جن کا جوڑا کسی بھی طرح بے جوڑ اور ان میل نظر نہیں آتا۔ جن کا تعلق اچھے گھروں اور گھرانوں سے ہے۔ یعنی بظاہر کوئی جواز اس نئے رشتے کا نظر نہیں آتا مگر یہ رشتہ بن رہا ہے اور اسے سنسکار اور مذہب تک نہیں روک پا رہے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا چندر پرکاش کہ کمی یا گھٹن اتنی زیادہ ہے یا تازگی کی ضرورت اس حد تک ہے کہ رشتہ بنانے والوں کو کسی کی پرواہ نہیں، کسی کا ڈر نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسی کمی ہے کہ جس نے ذہن و دل میں اضطراب پیدا کر رکھا ہے۔ ایسا اضطراب جو تمام بندھنوں کو توڑ رہا ہے۔ برسوں کی شناسائی جس کی زد میں آکر پاش پاش ہو رہی ہے۔ مدتوں کی پلی پلائی رفاقتیں دم توڑ رہی ہیں۔ چندر پرکاش! اس کمی کے بارے میں بھی سوچو! سوچو کہ تم زیادہ Creative ہو زیادہ Imaginative ہو! سوچو کہ اس سے ہمارے بزنس کے لیے ایک اور منصوبہ ہاتھ لگ سکتا ہے۔ ایک اور لائحہ عمل تیار ہو سکتا ہے۔

تاجر چندر پرکاش کا مشورہ اچھا تھا۔ منافع بخش بھی تھا۔ فنکار چندر پرکاش نے اس پر سوچا بھی۔ اس نے خود کو اندر باہر سے بار بار دیکھا۔ اپنے میں کمی تلاش کرنے کی پوری کوشش کی۔ خود کو دوسروں کی نظر سے بھی دیکھا۔ تنقیدی نقطۂ نظر بھی اپنایا۔ پوری ایمانداری برتی مگر کہیں بھی کوئی ایسا دھاگا نہیں دکھائی دیا جو کمزور ہو، رگڑ کھا گیا ہو، گھس گیا ہو۔ غرض کہ وہ اپنے اندر کمی پانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ دفعتاً اس کے ذہن میں خیال کا ایک کوندا لپکا۔ لپک کر اس نے اپنی بیوی کا موبائل سیٹ پھر سے اٹھا لیا۔

بٹن کے دبتے ہی میسیج بکس کے ڈرافٹ والا خانہ سامنے آ گیا۔ اس کا اندیشہ سچ نکلا۔ اس میں ایس۔ ایم۔ ایس کا ڈرافٹ موجود تھا جس کے جواب میں وہ ایس ایم ایس آیا

تھا جس نے اس کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا تھا۔

''بیس سال سے میں ایک ریگستان میں رہ رہی ہوں۔ یہاں چاروں طرف ریت ہی ریت ہے۔ کہیں پر کنواں ہے بھی تو اس کا پانی اتنا نیچے ہے کہ وہاں تک پہنچنا مشکل ہے۔ ایسے میں آپ میری پیاس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ آپ میرے لیے ایسے ہیں جیسے کسی پیاسے کے لیے دریا ہوتا ہے۔ میں اس ریگستان سے نکلنا چاہتی ہوں۔ اپنی تشنگی مٹانا چاہیت ہوں۔ سیراب ہونا چاہتی ہوں۔ جی چاہتا ہے دوڑ کر دریا کے پاس آجاؤں

اسے پڑھ کر چندر پرکاش کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ واقعی صحرا بن چکے ہیں۔ ان کا پورا وجود خشک ہو گیا تھا۔ دل و دماغ، جسم سب میں کانٹے اُگ آئے تھے۔

ایس ایم ایس باکس کو کھولتے وقت انھوں نے سوچا تھا کہ ڈرافٹ سے ان کے اندر کی کمی کا انھیں پتا چل جائے گا مگر جس کمی کا ذکر اس ڈرافٹ میں کیا گیا تھا اسے پڑھ کر ان کی آنکھیں حیران تھیں کہ لکھنے والے کے منہ سے وہ اکثر اس طرح کے جملے سن چکے تھے:

''جانو! تو میرے لیے کسی سمندر سے کم نہیں، تو نے مجھے ایسا سیراب کیا ہے کہ اس بنجر زمین پر بھی پھول کھل اٹھے ہیں۔''

سچ یہ تھا جسے چندر پرکاش کے کانوں نے بار بار سنا تھا یا سچ وہ تھا جسے کچھ دیر پہلے آنکھوں نے موبائل کے اسکرین پر پڑھا تھا۔ ان کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی کہ اچانک ان کے موبائل پر میسیج الرٹ ٹون بج اٹھی۔ بے دلی سے انگوٹھا موبائل کی طرف بڑھا اور نہایت بے توجہی کے ساتھ بٹن دبا مگر تحریر نے چندر پرکاش کو چونکا دیا۔

''سر! آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ آپ کا سوچتا ہوا چہرہ دل میں اتر جاتا ہے۔ آپ کے بولنے کا انداز اتنا دلکش ہے کہ جی چاہتا ہے ہر وقت آپ کو سنتی رہوں۔ میں نے اپنے اس احساس کو پہلے بھی کئی بار آپ تک پہنچانا چاہا مگر ہمت نہ ہو سکی۔ آج آپ کی بنائی ہوئی اسکیم نے میری مشکل آسان کر دی۔ امید ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گے۔ جواب دیں تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔''

چندر پرکاش طوفانی جھکڑوں اور گرم ریت کے جس ماحول میں گھر گئے تھے، یہ ایس ایم ایس اس وقت کسی باغ سے آیا ہوا ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا محسوس ہوا مگر اس جھونکے کا لمس دل تک ابھی پوری طرح پہنچا بھی نہ تھا کہ دماغ نے انھیں ایک اور حیرانی میں ڈال دیا۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ضروری کسی نے مذاق کیا ہے؟ دپتی اور مجھ میں تو بہت بڑا فاصلہ ہے۔ اتنا بڑا کہ..... حیران ہونے کی بات نہیں ہے چندر پرکاش! یہ جو جھونکا ابھی ابھی تمھاری طرف آیا ہے، یہ بھی ایک سچ ہے۔ سچ کو عمر کے گھیرے میں گھیر کر مت دیکھو۔ سچ کا کوئی دائرہ نہیں ہوتا۔ سچ کہیں بھی، کبھی بھی جنم لے سکتا ہے۔ یہ فاصلہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس سے بڑا فاصلہ بھی سچ کو کہیں آنے جانے سے نہیں روک سکتا۔ اگر یہ سچ نہیں ہوتا تو تمھیں ویسا محسوس نہیں ہوتا جیسے کہ ہوا، میرا ایک مشورہ مانو چندر پرکاش! اپنے دماغ کو راستے سے ہٹا کر دل کے دروازے کو پوری طرح کھول دو۔ موبائل کے پردے پر ابھری اس تحریر کے حرف حرف کو اپنے اندر اتر جانے دو۔ پھر دیکھوں کہ تمھارے اندر کیا ہوتا ہے؟ تمھارے دل کا اضطراب یوں ہی برقرار رہتا ہے کہ کچھ کم ہوتا ہے۔

میرے بھائی! سچ کوئی ایک نہیں ہوتا۔ سچ وہ بھی ہے جو تمھاری بیوی کے میسج بکس میں پڑا ہے اور وہ بھی جو تمھارے کانوں میں پڑتا رہا ہے اور یہ بھی جس نے تمھارے موبائل سے نکل کر ابھی ابھی تمھیں مس ہے۔ یہ سچ عجیب وغریب شے ہے۔ جو سچ نہیں لگتا وہ بھی سچ ہوتا ہے اور جو جھوٹ لگتا ہے، سچ وہ بھی ہوتا ہے۔

یہ سب تو ٹھیک ہے چندر پرکاش جی! مگر کیا واقعی میں اپنی بیوی کے لیے بیس سالوں تک صحرا بنا رہا؟ کیا سچ مچ کوئی میری وجہ سے اتنے برسوں تک پیاسا رہا؟

تمھارے ان سوالوں کا جواب تمھاری بیوی کے ان جملوں میں پوشیدہ ہے جنھیں وہ اکثر تمھارے کانوں میں ڈالتی رہی ہے۔ ذرا جملوں کو ایک بار پھر سے اپنے ذہن کے پردے پر لاؤ اور بتاؤ کہ کیا تم اپنی بیوی کے لیے سچ مچ سمندر تھے؟ کیا وہ بنجر زمین کی مانند ہے؟ کیا تم نے اسے اس طرح سیراب کیا کہ بنجر زمین سے بھی پھول کھل اُٹھے؟

یقیناً ان سوالوں کے جواب تم اثبات میں نہیں دے سکتے۔ چندر پرکاش! جس طرح اس بیان میں تخلیقی اڑان دکھائی دے رہی ہے اسی طرح اس کے ریگستان والے بیان میں بھی تخیلی پرواز شامل ہے۔ تخلیقی سحر کاری صرف تمھیں نہیں کر سکتے چندر پرکاش! یہ جادو دوسرے بھی دکھا سکتے ہیں۔ یہ سب اس تخلیقی قوت کا کرشمہ ہے میرے بھائی جس کا علم و ادراک مجھ سے کہیں زیادہ تم رکھتے ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ یہ سب محض تخیلی بیانات ہیں۔ سچ سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ سچ تو یہ ہے چندر پرکاش کہ یہ سارا کچھ سچ ہے۔ جینا ہے تو اس سچ کو ماننا ہوگا اور اگر دوسروں کو بھی زندہ رکھنا ہے تو مجھ سے مل کر رہنا ہوگا اور میری یہ بات یاد رکھنی ہوگی کہ منافع اچھائی اور ٹیکاؤ پن میں کم تازگی اور نئے پن میں زیادہ ہوتا ہے۔

تخلیق کار چندر پرکاش کے ذہن کے موبائل پر میسیج الرٹ ٹون بج اٹھی، ان کے موبائل سیٹ پر ابھری آخری تحریر ان بکس سے نکل کر آؤٹ بکس میں پہنچ گئی۔ حرف خط و خال میں تبدیل ہونے لگے۔ آہستہ آہستہ تصویر بننے لگی۔ نگاہیں نئے رنگ و روغن کی طرف کھنچنے لگیں۔

ڈُگڈُگی

شہر کے نکڑ پر ڈُگڈُگی بج رہی تھی۔لوگ ایک ایک کر کے ڈُگڈُگی بجانے والے کے اردگرد جمع ہوتے جا رہے تھے۔

ڈُگڈُگی بجانے والا سر سے پیر تک ایک مخصوص قسم کے لباس میں ملبوس ایک لحیم شحیم آدمی تھا۔اس کے سر اور داڑھی کے بال تماشائیوں کے بال سے مختلف تھے۔رنگ برنگ کے گول گول پتھروں سے بنی ایک لمبی مالا اس کے گلے میں لٹک رہی تھی۔تقریباً سبھی اُنگلیوں میں رنگین پتھروں کے نگ کی انگوٹھیاں تھیں۔ایک ہاتھ میں ایک پرکشش ڈُگڈُگی تھی جو مسلسل رقص کر رہی تھی اور دوسرے ہاتھ میں چمچاتی ہوئی بانسری جس کے منھ والے سوراخ کے ذرا نیچے سرخ رنگ کے پھندنے لٹک رہے تھے۔

ڈُگڈُگی والے نے ایک جھٹکے کے ساتھ ڈُگڈُگی بند کر دی۔''ہاں تو قدردان! آپ نے سانپ اور نیولے کی لڑائی کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوگا۔آج ہم آپ کو آنکھوں سے دِکھائے گا کہ سانپ اور نیولے کی لڑائی کیسی ہوتی ہے؟ نیولا کس طرح سانپ کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے؟—اور پھر اُن ٹکڑوں کو ایک جڑی کی مدد سے کس طرح جوڑ دیتا ہے؟——قدردان یہ انوکھی لڑائی ہم آپ کو دِکھائے گا اور ضرور دِکھائے گا۔

لڑائی دِکھانے سے پہلے ہم ہندو بھائی سے پرارتھنا
کرتا ہے کہ وہ ایک بار پریم سے بولیں —— شنکر بھگوان کی
جے —— جے۔ اے، ے، ے، ے، ے ....

"جے" کی آواز آس پاس کے ماحول میں گونج گئی۔

"اور اپنے مسلمان بھائی سے ہماری درخواست ہے کہ وہ
ایک بار دل سے نعرہ لگائیں —— نعرۂ تکبیر —— اللہ ہو اکبر ....

..... اللہ ہو اکبر کی صدائیں بلند ہو کر چاروں طرف پھیل گئیں۔

لوگوں کی بھیڑ دُگنی ہو گئی۔

ڈُگڈُگی والے نے بانسری کو منہ سے لگالیا اور ڈُگڈُگی والے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دے کر آہستہ آہستہ ہلانے لگا۔

ڈُگ، ڈُگ، ڈُگ، ڈُگ — ڈُگ — ڈُگ

اُس کے ساتھ بانسری بھی ڈُگڈُگی کی سنگت کرنے میں مصروف ہو گئی۔

ڈُگڈُگی والا بانس کی کھپچیوں سے بنی ہوئی ایک پٹاری کا پھیرا لگانے لگا جس میں سانپ بند تھا۔ چند پھیروں کے بعد بانسری کی آواز بند ہو گئی۔ ڈُگڈُگی بجتی رہی۔ پھر ڈُگڈُگی کھنک کر خاموش ہو گئی۔

"دیکھیے قدر دان! ہوشیار ہو جایئے۔ اَب ہم سانپ کو نکالے گا۔"

ڈُگڈُگی والا پٹاری کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ لوگوں کے بے تاب نگاہیں پٹاری پر مرکوز ہو گئیں۔

چند لمحے بعد اس نے پٹاری کا ڈھکن ذرا سا اُوپر اُٹھا دیا۔

مجمع سے کئی گردنیں آگے کو جھک گئیں۔

"ہاں، تو قدر دان! یہ سانپ وہ نہیں جسے آپ دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ سانپ سائبیریا کے جنگل میں رہتا ہے۔ یہ ایک وی چتر سانپ ہے۔ اس کے کئی منہ اور کئی سر ہیں۔ اس کے ایک سر پر ایک خوبصورت سا تاج بھی ہے —— اچھا تو لیجیے اب ہم

ڈھکن کو اُٹھاتا ہے۔

اُس نے ڈھکن کو ذرا اور اُوپر اُٹھا کر اپنی آنکھیں پٹاری کے اندر ڈال دیں۔ لوگوں کی گردنیں آگے کو جھک گئیں۔

''کیا؟ــــــ ابھی نہیں؟''

''قدردان ناگ راج کا کہنا ہے کہ وہ ابھی موڈ میں نہیں ہیں۔''

اور اُس نے ڈھکن کو گرا دیا۔

''بچہ لوگ ذرا زور سے تالی بجاؤ تا کہ ناگ راج مست ہو کر موڈ میں آجائیں۔''

تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے آسمان دہلنے لگا۔

تالی بجانے والوں میں کچھ لوگوں کے علاوہ چھوٹے بڑے سبھی لوگوں کے ہاتھ رُکے تو ڈُگڈگی والے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، کچھ زیادہ مزا نہیں آیا۔ ذرا اور زور سے بجایئے۔''

اس بار پہلے سے زیادہ زور کی گڑگڑاہٹ ہوئی

بھیڑ اور بڑھ گئی

بانسری بجاتا ہوا ڈُگڈگی والا ایک تھیلے کے پاس جا کر رُک گیا۔ بانسری کو روک کر اُس نے ڈُگڈگی والے ہاتھ کو تین بار مخصوص انداز سے جھٹکا دیا۔ اور تینوں بار ایک خاص طرح کی آواز نکال کر ڈُگڈگی خاموش ہوگئی۔ اس نے ڈُگڈگی زمین پر رکھ دی۔ اور تھیلے کا منھ سرکا کر اپنا ایک ہاتھ اس میں ڈال دیا۔

لوگوں کی نظریں تھیلے میں داخل ہونے کی کوشش میں مصروف ہوگئیں۔ چند لمحے بعد ڈُگڈگی والے کا ہاتھ تھیلے سے جب باہر آیا تو مٹھی بند تھی۔ اُس نے مٹھی کو آسمان کی طرف لے جا کر کھول دیا۔ رنگین پتھروں کے کئی چوکور ٹکڑے اُچھل کر زمین پر آگرے۔

زمین سے ایک پتھر اُٹھا کر ڈُگڈگی والے نے ہتھیلی پر رکھ لیا۔

''قدردان! آپ اِسے دیکھ رہے ہیں؟ــــــ یہ آپ کو پتھر معلوم ہو رہا ہوگا۔ لیکن قدردان! یہ پتھر نہیں، یہ ایک بہومولیہ دستو ہے۔ ایک بیش بہا چیز ہے۔ اس

میں اَن گنت گُنڑ چھپے ہوئے ہیں۔اس کے بہت سارے فائدے ہیں۔

آپ جاننا چاہیں گے یہ کیا چیز ہے اوراس میں کیا کیا گُنڑ ہیں؟ تو قدردان! ہم آپ کو بتائے گا اوراس کا فائدہ بھی دِکھائے گا لیکن ابھی نہیں پہلے ہم آپ کو سر پر تاج والے سانپ اور نیولے کی لڑائی دِکھائے گا۔"

اس نے ڈُگڈُگی کو پھراسی مخصوص انداز سے جھٹکا دیااور آہستہ آہستہ ہاتھ ہلاتا ہوا نیولے کی طرف بڑھ گیا۔

"ہاں،تو بھائی نیولے راجہ!لڑائی شروع ہو جائے۔"

ڈُگڈُگی والا نیولے سے مخاطب ہوا۔

کیا——؟نہیں؟لیجیے صاحب یہ ابھی منع کررہے ہیں۔

"کیوں؟ کیا دودھ پئیں گے؟"

"قدردان! یہ پہلے دودھ پینا چاہتے ہیں۔اچھی بات ہے۔ہم آپ کو پہلے دودھ پلائے گا۔"

اس نے تھیلے کے پاس رکھی ہوئی دودھ کی پیالی کو اُٹھا کر نیولے کے پاس رکھ دیا۔

"قدردان! گھبرائیے نہیں،بس چند ہی منٹ بعد ہم آپ کو لڑائی دِکھائے گا۔"

اُس نے بانسری منہ سے لگالی۔

سپیرا بین بجا————بین بجا————ناچوں گی..............کی مدھر دھن بانسری سے نکلنے لگی۔

"جی ہاں!اس پتھر کے بارے میں بھی بتائے گااور اِس کا فائدہ بھی دِکھائے گا۔"

مجمع میں کھڑے ایک شخص کی طرف اُس نے اپنی توجہ مبذول کردی۔

"ہاں،ہاں،ابھی بتائے گا۔"

اُس نے ایک پتھر خلا میں اچھال کر ہتھیلی پر روک لیا۔

"قدردان!ہم نے بتایا تھا کہ یہ پتھر نہیں ہے۔ایک بہومولیہ وستو ہے،ایک

بیش بہا چیز ہے۔ اس میں اَن گنت گنڑ چھپے ہوئے ہیں ——— لیجیے ہم آپ کو اس کا گنڑ بتاتا ہے۔

گنڑ نمبر ایک ——— اگر کسی کو زہریلا سے زہریلا سانپ نے کاٹ لیا ہو ——— یہ پتھر تریاق کا کام کرے گا۔ جس جگہ سانپ نے کاٹا ہو اُس پتھر کو پانی میں ڈبو کر وہاں رکھ دیجیے۔ یہ چپک جائے گا۔ اور اس وقت تک چپکا رہے گا جب تک شریر میں زہر ہوگا۔ جب یہ پتھر اس جگہ کو چھوڑ دے تو سمجھنا شریر سے زہر نکل چکا ہے۔

گنڑ نمبر دو ——— کسی آدمی کو بچھو نے ڈنک مار دیا ہو اور وہ آدمی زمین پر دہاڑیں مار مار کر لوٹ رہا ہو آپ اسے پتھر پر رگڑ کر چپکا دیں، سارا زہر منٹوں میں غائب اور لوٹ پوٹ آن کے آن میں ختم ———

گنڑ نمبر تین ———

مجمع سے اِکے دُکے لوگ نکل کر جانے لگے ———

قدر دان! جائیے نہیں ——— ابھی کھیل دِکھائے گا ——— آپ کھیل دیکھ کر جائیے گا۔ آپ کو بہت مزا آئے گا۔ لیجیے ہم ابھی دِکھاتا ہے ———

ڈُگڈگی بجاتا ہوا وہ نیولے کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے نیولے کی رسی ڈھیلی کر دی۔ نیولا پٹاری کے قریب پہنچ کر چکر کاٹنے میں مصروف ہو گیا۔ ڈُگڈگی والا پٹاری کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ڈُگڈگی جھٹکے کے ساتھ کھنکی اور خاموش ہو گئی۔

اُس نے پٹاری کا ڈھکن اُٹھا کر اس میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ لوگوں کی گردنیں ایک بار پھر آگے کی طرف جھک گئیں۔

کچھ توقف کے بعد ادھ کھلی پٹاری سے اس نے جب اپنا ہاتھ باہر نکالا تو اس میں کتھئی رنگ کے سانپ کی بل کھاتی ہوئی ایک دُم تھی۔

قدر دان! یہ سانپ بہت خطرناک ہے۔ اس کے کاٹے ہوئے آدمی کو صرف ایک چیز بچا سکتی ہے۔ اور وہ ہے یہ فقیری دوا۔

اس نے پتھر کے چوکور ٹکڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

جس بھائی کو شبہ ہو اور وہ آزمانا چاہتے ہوں وہ ہمارے پاس آجائیں۔ ہم اس سانپ سے اُن کو کٹوائے گا اور اس فقیری دوا کی مدد سے زہر کو منٹوں میں زائل کردے گا۔

ہے کوئی ہمت والا! ہے کوئی جواں مرد! ہے کوئی بہادر نوجوان تو نکل کر سامنے آئے اور اس فقیری دوا کو آزما کر دیکھے۔

کوئی نہیں ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہم ابھی آپ کو اس کا ایک نمونہ دِکھاتا ہے۔

سانپ کے دم کو چھوڑ کر وہ تھیلے کے پاس آگیا۔ اور تھیلے سے اس نے ایک سرخ رنگ کی ٹکیہ نکال لی۔

''قدردان! اس ٹکیہ کو ہم اس گلاس میں ڈالتا ہے۔ اس نے پانی سے بھرے ہوئے گلاس میں ٹکیہ ڈال دی۔

''قدردان! دیکھیے یہ پانی خون ہوگیا۔ اس کا رنگ خون کی طرح بالکل سرخ ہے۔ اب اس گلاس کو ہم اس پٹاری میں رکھے گا اور سانپ اس میں اپنا منھ ڈالے گا اور پھر آپ دیکھیں گے کہ اس کا رنگ کیسا ہو جاتا ہے؟''

اس نے گلاس کو پٹاری کے اندر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اس نے پٹاری سے گلاس کو باہر نکالا تو خون کا رنگ کالا ہو چکا تھا۔

''قدردان! جس شخص کو یہ سانپ کاٹ لیتا ہے اسی طرح اس کا خون کالا ہو جاتا ہے۔ اب ہم آپ کو اس فقیری دوا کا کمال دِکھاتا ہے۔''

اُس نے ایک پتھر کا ٹکڑا اُٹھا کر گلاس میں ڈال دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گلاس کے پانی کا رنگ پھر خون میں تبدیل ہوگیا۔

''قدردان! دیکھا آپ نے اس فقیری دوا کا کمال۔ یہ تو اس کا صرف ایک کمال ہے۔ ایک گنڑ ہے۔ ایسے ایسے تو اس میں بیسیوں گنڑ چھپے ہوئے ہیں۔ اس کے چند اور فائدے ہم آپ کو بتاتا ہے——

کسی کو مرگی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ آپ اس ٹکیہ کو اس آدمی کی ناک کے پاس لے

جائیں فوراً ہوش میں آجائے گا اور اگر مرگی کا مریض اسے اپنے پاس رکھے تو اسے کبھی دورہ نہیں پڑے گا۔

اسی طرح کسی کو پرانا سے پرانا بواسیر ہو، اور لاعلاج بن چکا ہو۔ آپ اس دوا سے صرف ایک ہفتہ سیکائی کریں مسّہ گل کر راکھ ہو جائے گا۔

قدردان! اس کے اور بہت سے فائدے ہیں جن کا ذکر اس پمفلٹ میں تفصیل سے چھپا ہوا ہے۔"

اُس نے پمفلٹ اُٹھا کر ایک ایک کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"قدردان! اتنے سارے گنڑ اس فقیری دوا میں موجود ہیں۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ اس کی قیمت بہت زیادہ ہوگی، لیکن نہیں ——— قیمت کچھ بھی نہیں ہے۔ بالکل مفت ہے۔ فقیر کی دی ہوئی چیز ہے۔ اس کا دام کچھ بھی نہیں ہے۔ ہاں فقیر کے نیاز کے لیے ایک معمولی سی رقم بطور چندہ ضروری لی جاتی ہے۔ اور وہ معمولی سی رقم ہے ——— ایک روپیہ ——— صرف ایک روپیہ ——— ایک روپیہ ——— ایک روپیہ ——— ایک روپیہ ——— جس کسی بھائی کو ضرورت ہو آواز دے کر مانگ سکتے ہیں۔"

"ایک ٹکیہ مجھے، ایک ٹکیہ مجھے، دو مجھے، ایک.....

"ابھی دیا۔ ابھی دیتا ہے قدردان! ابھی آیا سرکار۔ آپ کو بھی دیا....."

کچھ دیر بعد ڈگڈگی والا روپے گننے میں مصروف تھا۔

تقریباً آدھے سے زیادہ لوگ جا چکے تھے۔ شاید وہ اس سے پہلے بھی ڈگڈگی کی آواز پر جمع ہو چکے تھے اور کچھ لوگ اس انتظار میں ابھی ٹھہرے ہوئے تھے کہ ڈگڈگی والا اپنا وعدہ پورا کرے گا یعنی تاج والے سانپ اور نیولے کی لڑائی ضرور دِکھائے گا۔ غالباً یہ لوگ ڈگڈگی کی آواز پر پہلی بار جمع ہوئے تھے۔ ———

———

بھڑ

''کیا آپ لوگوں کو ایسا نہیں لگتا کہ ہمیں بھی اس آواز پر لبیک کہنا چاہیے۔''

حیرت ہے کہ جو کل تک سریندر پرکاش کی کہانی ''باز گوئی'' کے اس نظریے پر سختی سے قائم تھا کہ جب کوئی شب روزی مل جاتی ہے تو فن کار کی بانسری بند ہو جاتی ہے بلکہ ہاتھ سے چھوٹ کر گر جاتی ہے اور ظلمت کے خلاف انقلابی دھن بجانے والا موسیقار شب روزی کے ہمراہ ہم بستری میں مصروف ہو جاتا ہے اور قرۃ العین حیدر کے ناول کا کردار ریحان دا بھی کامریڈ نہیں رہ پاتا بلکہ وہ بھی کاردار بن جاتا ہے۔

میں نے حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھا تو بولا

''ڈاکٹر صاحب! میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ اس معاملے میں میں کافی سیریس ہوں۔

ہماری یہ گفتگو اس نئی آواز کے متعلق تھی جو کچھ دنوں پہلے گونجی تھی اور نہایت سرعت کے ساتھ بلند سے بلند تر ہوتی گئی تھی اور جو اُن دلوں میں بھی پہنچ کر گھر بنانے لگی تھی جن سے آوازیں ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ لیا کرتی تھیں۔

یہ آواز واقعی نئی آواز تھی۔ نہایت صاف، شفاف، منزّہ، مدھر، منفرد اور ممتاز۔ یہ آواز دل سے نکلی تھی اور برسوں کی تپسیا اور سادھنا کے بعد اس جوش، جذبہ اور قوت سے نکالی گئی تھی کہ سنتے ہی سماعتیں چونک پڑی تھیں۔

یہ آواز قفنس کی اس آواز کی مانند تھی جس کے منقار سے نکلتے ہی پرند اس کی جانب دیوانہ وار پرواز بھر لگتے ہیں مگر اس سحر انگیز آواز کو نکالنے والا سحر ساز اس قفنس کی طرح نہ تھا جو اپنی آواز کی کشش پر پاس آئے پرندوں کو دبوچ کر اپنے منہ میں رکھ لیتا ہے۔

وہ لوگ جو آوازوں پر کبھی کان نہیں دھرتے تھے، وہ بھی اس آواز پہ ہمہ تن گوش ہو گئے تھے اور ان میں سے بیشتر کے پاؤں اس صدائے فسوں ساز کی جانب بڑھنے بھی لگے تھے۔ لوگ اس آواز کی سمت اس طرح بڑھ رہے تھے جیسے ڈگڈگی کی آواز پر گھروں سے بچے نکلتے ہیں جبکہ بیشتر لوگوں کے ذہنوں میں یہ تماشا موجود تھا کہ مداری ڈگڈگی کی آواز پر مجمع لگاتا ہے۔ سانپ اور نیولے کی عجیب و غریب لڑائی دکھانے کی دلچسپ تمہید باندھتا ہے، بار بار پٹاری کھولتا، بند کرتا ہے اور لڑائی دکھائے بغیر اپنا تیل بیچ کر چل دیتا ہے۔ شاید لوگوں کے پاؤں اس لیے بھی بڑھ رہے تھے کہ ان کی آنکھوں میں اس نئی آواز والے شخص کا حلیہ بھی داخل ہو چکا تھا:

اس کے ہاتھ میں کوئی ڈگڈگی نہیں تھی۔ اس کی انگلیاں رنگ برنگ کے نگوں والی انگوٹھیوں سے خالی تھیں۔ گلے میں رنگین اور چمک دار موتیوں کی کوئی مالا بھی نہیں تھی۔ اس کے بال بھی نارمل تھے۔ اس کے جسم پر کسی مخصوص قسم کا کوئی لبادہ بھی نہیں تھا۔ اس کا لباس بالکل سادہ تھا۔ سر سے پا تک سادہ، نہ کپڑے میں کوئی تاب نہ رنگ میں کوئی آب۔ کوئی گل بوٹا نہیں، کوئی پیوند کاری نہیں، کوئی تکمہ نہیں، کوئی پھندنا نہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس آواز کے اردگرد ایک عالم اکٹھا ہو گیا۔ اس آواز سے انسانی سماعتیں تو متاثر ہوئیں ہی فطرت بھی متحرک ہو اٹھی:

پُرشور فضائیں مترنم ہو گئیں
حبس زدہ ماحول میں تازہ ہوائیں گھلنے لگیں۔
گم سم سے بیٹھی ہوائیں چلنے اور بولنے لگیں

پیڑوں کی ساکت شاخیں ہلنے لگیں
فالج زدہ پتے جھومنے لگے
پرندوں کے خاموش لب کھلنے لگے

اس آواز اور اس آواز کی بدولت فطرت کے بدلے ہوئے تال سر نے بہت کم وقت میں وہ کر دکھایا جو مدتوں میں بڑے بڑے ساز اور اونچی آواز والے مطرب بھی نہ کر سکے:

حالتِ حبس میں ہوا محسوس ہونے لگی
ذہن و دل کی گانٹھیں کھلنے لگیں
دردِ سر کنے لگا
کرب میں کمی آنے لگی
اضطراب ٹھہرنے لگا
یاس آس میں بدلنے لگی
سرابوں میں سیرابی سرسرانے لگی

پہلی بار مجھے بھی یہ خیال آیا تھا کہ اس آواز کی طرف بڑھنا چاہیے۔ اس سُر پہ کان دھرنا چاہیے۔ اس لیے کہ اس سر میں مجھے بھی وہ سُر محسوس ہوا تھا جو گھٹن کو دور کرنے اور سانسوں میں سنگیت گھولنے والا سُر تھا۔ جس میں زہراب کو آبِ زلال بنانے والا جوہر موجود تھا۔ وہ آواز واقعی صدائے نجات تھی اور عنقریب ہم سب اس کے قریب پہنچنے والے تھے کہ اچانک لوگوں کا اس آواز کی سمت آنے اور اس کے پاس موجود لوگوں کا اس سے بٹنے اور دور جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سبب یہ نہیں تھا کہ کسی نے لوگوں کی سماعت میں یہ بات ڈال دی تھی کہ اس شخص کی آواز بھی آخرِ شب کے ہم سفر ریحان دا اور بازگوئی کے فن کار کی بانسری کی آواز جیسی ہی ثابت ہوگی۔ سبب پر میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس کی آواز میں کچھ تبدیلی سی پیدا ہو گئی تھی۔ اس میں اب وہ پہلے جیسا سُر نہیں تھا جو شروع شروع میں ابھرا تھا۔ سماعتوں کو

ناگوار لگنے والے کچھ عناصر بھی اس آواز میں داخل ہو گئے تھے۔

اس تبدیلی کے سبب کو جاننے کے لیے میرا تجسس بڑھتا گیا۔ چھان بین کرنے پر بس اتنا پتا چلا کہ کسی دن اس کے اُوپر بھڑ کا کوئی چھتا گرا تھا۔ اس چھتے سے بھڑیں نکلی تھیں اور وہ بھڑیں اس کے گلے سے چمٹ گئی تھیں۔ شاید تب ہی سے اس کی آواز متاثر ہو گئی تھی۔

یوں اچانک اپنی آواز میں پیدا ہوئی خرابی سے وہ دکھی رہنے لگا۔ اپنی آواز سے زیادہ دکھ اسے اس بات کا تھا کہ لوگ اس سے دور جا رہے تھے۔ پوری طاقت سے ایک اور آواز اس کے اندر سے اُٹھ رہی تھی کہ وہ لوگوں کو روکے۔ انھیں بتائے کہ یہ عارضی خرابی ہے۔ زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہے گی مگر یہ آواز باہر آتے آتے بے اثر ہو جاتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ یہ آنسو اپنے لیے کم اور دوسروں کے لیے زیادہ تھے۔ یہ آنسو ان کے لیے تھے جن کی خاطر اس نے رشیوں منیوں جیسی ریاضت کی تھی۔ جو مینکاؤں کے رقص سے بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔ جو اپنی قوتِ مدافعت شیطانی شعبدوں اور زمانی کرشموں کے سحر سے بھی بچتا رہا تھا۔

اس کی آواز کی جانب جاتے ہوئے لوگ مجھے اچھے لگے تھے مگر وہاں سے واپس آتے ہوئے اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں ان کے رستے میں کھڑا ہو جاؤں، انھیں روک لوں مگر میں کیسے روکتا؟ کیا کہتا؟ میں تو خود بھی تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔

چھتے کا گرنا، چھتے سے بھڑوں کا نکلنا اور ان بھڑوں کا اس کے گلے سے چمٹنا کیا محض اتفاقات تھے یا کچھ اور۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس اُلجھن کو لے کر میں خاصا پریشان رہنے لگا تھا کہ اچانک اُن پروفیسر صاحب کی یاد آئی گئی جنھوں نے ایک دن ہم سب کو بھی اس آواز پر لبیک کہنا کا مشورہ دیا تھا۔

جب میں نے بھڑوں والی بات ان سے بتائی تو بولے:

'یہ اتفاق نہیں ہو سکتا۔'

'تو کیا ہو سکتا ہے؟' میں نے دوسرا سوال کر دیا

'سبب'۔ نہایت سنجیدگی سے انھوں نے جواب دیا۔

'سبب؟ کیسا سبب میں کچھ سمجھا نہیں؟'

'سبب یعنی کچھ آوازیں ہیں جو اس آواز کے راستے میں کھڑی ہوگئی ہیں۔'

'آوازیں! کون سی آوازیں؟'

'وہ آوازیں جو آخرِ شب کے ہم سفر ریحان دا اور 'باز گوئی' کے فن کار جیسے لوگوں کے ہونٹوں سے نکلتی ہیں۔'

'یہ آواز اُن آوازوں کے راستے کا سبب کیوں کر بن سکتی ہیں؟'

'یہ آواز اُن سے مختلف ہے اور اُن کو ڈر ہے کہ کہیں یہ اُن کے گلے کے لیے بھڑ نہ بن جائے'

'اس لیے انھوں نے بھڑ۔۔۔۔۔'

'ہاں اسی لیے۔'

میری آنکھوں کے آگے بھڑ کا ایک چھتّا اُبھر آیا۔

سائبر اسپیس

شتابدی ایکسپریس، سوپر فاسٹ میل، پسنجر ٹرین، بس، بدنیت، بے ہنگم، بدبودار دھواں چھوڑتی اور پھٹپھٹ کرتی میٹاڈور، ہچکولے کھاتی رکشا اور تنگ و پرخار پیدل کا سفر طے کر کے وہ اس بستی میں داخل ہوا۔

دھند اور دھول سے اٹی بے جان اور سنسان بستی کو دیکھتے ہی جیتی جاگتی جگمگاتی شہری آبادی کا ایک پرُنور منظر اس کی آنکھوں میں جھلملا اُٹھا۔

کچھ دیر تک آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے دونوں منظروں میں سے روشن منظر کہیں چھپ گیا اور سیاہ منظر اپنی آنکھیں کھول کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی جزیرے میں پہنچ گیا ہے۔ اس کے اردگرد بہت سارے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ اور اسے وہ اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے ان کی نگری میں کسی نئی دنیا کی کوئی مخلوق آ گئی ہو۔

وہ وہاں کی ایک ایک چیز کو حیرت و استعجاب سے دیکھتا اور پوچھ تاچھ کرتا ہوا اس بستی کے اُس آدمی کے پاس پہنچ گیا جس سے اس کے مشن میں رہنمائی ملنے والی تھی۔

''تمہارا ہی نام چورسیا ہے؟'' اس نے اس آدمی کو سر سے پا تک گھورتے ہوئے پوچھا۔

''جی صاحب!''

''تم پڑھے لکھے ہو؟''

''تھوڑا تھوڑا۔''

''کہاں پڑھا؟''

''آپ ہی جیسا ایک صاحب گھر کے کام کاج کے لیے مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا، وہیں۔''

''کتنے دنوں تک رہے؟''

''کافی دنوں تک''

''چلے کیوں آئے؟''

''صاحب کہیں دور چلا گیا اور گھر والوں کی یاد بھی آنے لگی۔ اس لیے۔''

''یہاں کیا کرتے ہو؟''

''کام۔''

''کیسا کام؟''

''محنت مزدوری کا کام۔''

''میں تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔''

''مجھ سے کیا کام ہے صاحب؟'' چور سیا نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے تمہاری مدد چاہیے۔''

''میری مدد!'' اس کی حیرت اور بڑھ گئی۔''

''ہاں تمہاری مدد۔''

''کیسی مدد صاحب؟''

''میں یہاں کے لوگوں کے جیون پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔''

یہ سنتے ہی چور سیا کے ذہن میں کسی کتاب کا ایک صفحہ کھل گیا۔ ''گائے ایک چوپایا جانور ہے۔ اس کی دو آنکھیں ہوتی ہیں۔ دو کان اور دو سینگ ہوتے ہیں۔ ایک ناک اور ایک پونچھ ہوتی ہے۔ وہ اجلے، کالے بھورے اور چتکبرے رنگ کی ہوتی ہے۔ گائے

دودھ دیتی ہے۔اس کے دودھ سے دہی جمتا ہے۔مکھن نکلتا ہے۔گھی ملتا ہے۔وہ سال میں ایک بار بچھڑا دیتی ہے۔اس کا بچھڑا بڑا ہوکر بیل بنتا ہے۔بیل بوجھ ڈھوتا ہے۔گائے کی کھال سے جوتے اور بیگ بنتے ہیں۔اس کی چربی اور ہڈی سے طرح طرح کی دستوئیں بنائی جاتی ہیں۔''

''صاحب!میں جانتا ہوں آپ کیا لکھیں گے؟''

''کیا کہا؟تم جانتے ہو کہ میں کیا لکھوں گا؟''وہ چونک کر چورسیا کی طرف دیکھنے لگا۔

''جی صاحب۔''

''اچھا تو بتاؤ کہ میں کیا لکھوں گا؟''

''آپ لکھیں گے کہ چندن باڑی کے لوگ نانے اور کالے ہوتے ہیں۔ان کا شریر گندا ہوتا ہے۔دانت پیلے ہوتے ہیں۔آنکھوں میں کیچڑ بھرا رہتا ہے۔ان کے گال پچکے ہوئے ہوتے ہیں اور چھاتی کی ہڈیاں باہر نکلی ہوتی ہیں۔وہ باجرے کی روٹی،اول کا بھرتا،موٹے چاول کا بھات اور کھساری کی دال کھاتے ہیں.....''

''میں لیکھ لکھنے نہیں آیا ہوں۔''

''تو کیا لکھنے آئے ہیں صاحب؟''

''رچنا۔''

''رچنا معنی؟''

رچنا معنی کویتا اور.....

''کویتا!سمجھا؟''

سچی باتیں کہنا سیکھ　　سب سے ہل مل رہنا سیکھ
سیدھی راہ پہ چلنا سیکھ　　سب کا آدر کرنا سیکھ
طوفاں سے ٹکرا کر بھی　　ہر پل آگے بڑھنا سیکھ

''یہی نا صاحب۔''

''ایسی رچنا نہیں۔''

''تو کیسی رچنا صاحب؟''

''ایسی رچنا جس میں یہاں کے لوگوں کا اصلی جیون سما جائے۔ یہاں کی آتما اس میں پوری طرح رچ بس جائے۔'' چورسیا کی آنکھوں میں سارا گاؤں سمٹ آیا۔ ایک ایک گھر، ایک ایک آنگن اُبھر گیا۔ ایک ایک چہرہ اپنے درد و کرب کے ساتھ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

چورسیا کی آنکھیں جو برسوں سے سوکھی پڑی تھیں ایک دم گیلی ہو گئیں۔

''یہاں کی آتما آپ کو دکھائی دے گی صاحب؟'' اس کی آواز بھی بھیگی ہوئی نکلی۔

''کیوں نہیں، تم مدد کرو گے تو ضرور دکھائی دے گی۔''

''ہم سے کیا مدد چاہیے صاحب؟''

''یہی کہ تم اپنے بھیتر کا حال بتاؤ۔ اپنے لوگوں سے بات کراؤ۔ اپنی عورتوں سے ملواؤ۔

''عورتوں سے!'' چورسیا کی آواز کا بھیگا پن یکا یک غاب ہو گیا۔ جیسے بھاپ بن کر اُڑ گیا ہو، وہ معنی خیز نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''چورسیا، تم غلط سمجھے۔ دراصل میں یہاں کی عورتوں سے اس لیے ملنا چاہتا ہوں کہ ان کا حال میں ان کی زبان سے سن سکوں۔ یہ جان سکوں کہ وہ کس طرح رہتی ہیں؟''

''معاف کرنا صاحب! میں نے سمجھا شاید..... پر صاحب! وہ اپنے بھیتر کا حال آپ کو کیسے بتائیں گی جو اپنے مردوں تک کو نہیں بتا پاتیں۔''

''کیوں نہیں بتا پاتیں؟''

''یہ تو وہی جانیں صاحب''

''تم لوگ کبھی پوچھتے نہیں؟''

''پوچھا تو تب جائے نا صاحب جب کوئی جاننا چاہے۔''

تو کیا سچ مچ تم لوگ جاننا نہیں چاہتے؟'' اس کی حیرت بڑھ گئی۔

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''ہمارا اپنا دُکھ کیا کم ہے کہ ہم ان کا دکھ جاننے کا پریاس کریں۔''

''سنا ہے تم لوگ اپنی عورتوں کو مارتے بھی ہو؟''

آپ نے ٹھیک سنا ہے صاحب۔''

''کیوں مارتے ہو؟''

''سچی بات بولوں صاحب۔''

''ہاں، بولو۔''

''وہ کمزور ہیں اس لیے۔''

''مطلب؟''

''مطلب صاف ہے صاحب! مار تو کمزور ہی پر پڑتی ہے نا۔ چاہے بھگوان کی مار ہو چاہے شیطان کی۔ دُکھ اور مصیبت میں جب ہمارا کوئی بس نہیں چلتا تو ہم اپنا غصہ اپنی عورت پر نکالتے ہیں۔ آپ ہی بتایئے صاحب ہم اپنے بھیتر کی بھڑاس کس پر نکالیں۔ ان پیڑوں پر یا اس دھرتی پر؟''

چورسیا کی بات سن کر اس کی نظریں دھرتی پر مرکوز ہو گئیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے چورسیا نے کسی گہرے فلسفے کی طرف اشارہ کر دیا ہو۔ زمین سے انسان کے رشتے کی بہت ساری گتھیاں اُبھرتی چلی گئیں۔ اس کا ذہن دیر تک گتھیوں میں اُلجھا رہا۔ کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نے چورسیا کو پھر مخاطب کیا۔

''اچھا یہ بتاؤ تم لوگ کس طرح زندگی گزارتے ہو؟''

چورسیا اس سوال پر کچھ دیر سوچتا رہا۔ بیچ بیچ میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر ایک

طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''اُس طرح۔''

اس کی نظریں اشارے کی طرف مڑ گئیں۔

کچھ فاصلے پر کنکریلی زمین کے اوپر ایک مریل بچہ جس کا پیٹ ڈھول کی طرح پھولا ہوا تھا۔ چھاتی کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ بے سدھ پڑا تھا اور اس کے پاس ہی ایک خارش زدہ پلّا لیٹا تھا۔ دونوں کے اوپر مکھیاں بھن بھنا رہی تھیں۔

اس کی نگاہیں بچّے اور پلّے کے پاس سے لوٹ کر دوبارہ چورسیا کے چہرے پر کوز ہو گئیں۔

چورسیا کی آنکھیں دیا لونگاہوں کی گرمی سے پگھل کر موم کی طرح ٹپکنے لگیں۔ ایک کی آنکھیں خاموشی سے اپنا درد بیان کرتی رہیں اور دوسری کی آنکھیں اسے دیر تک تکتی رہیں۔

''تمہاری اِچھائیں کیا ہیں؟'' اُس نے کافی دیر بعد چورسیا سے دوسرا سوال کیا۔

''وقت پر دو جون کی روٹی۔ صاف پانی۔ موسم سے بچانے والا کپڑا اور بچھاون والا بستر۔''

''بس۔''

صاحب آپ نے ''بس'' کیوں کہا؟

''بس نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟'' تم نے جو گنوائی ہیں یہ اِچھائیں تھوڑی ہی ہیں۔

''یہ اچھائیں نہیں تو اور کیا ہیں؟''

''یہ تو آوشیکتائیں ہیں۔''

''اور اِچھائیں کیا ہوتی ہیں صاحب؟''

''اِچھائیں آوشیکتاؤں سے اوپر ہوتی ہیں۔ میں سمجھتا تھا تمہاری اِچھائیں بھی ہماری طرح ہوں گی۔ یعنی تمہیں بھی گاڑی، بنگلہ، نوکر چاکر کرسی عیش وآرام وغیرہ کی

اچھا ہوگی۔''

''صاحب آپ ہم پر کچھ لکھنے آئے ہیں نا؟

''ہاں، کیوں؟''

''آپ ہم پر نہیں لکھ سکتے؟''

''کیوں نہیں لکھ سکتے؟'' وہ چونک پڑا۔

''اس لیے کہ ہم آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔''

''کیوں بھائی! سمجھ میں کیوں نہیں آسکتے۔''

''ہم آپ سے بالکل الگ ہیں صاحب۔ بالکل الگ۔''

''تو کیا ہوا؟''

''ہم کو قریب سے دیکھے بنا آپ ہمیں نہیں سمجھ سکتے۔''

''ہم تو اسی لیے آئے ہیں کہ قریب سے دیکھیں۔''

''تو ہماری ایک رائے مانیے صاحب۔''

''بولو۔''

''کچھ دنوں تک آپ ہم میں رہے۔''

''ٹھیک ہے کچھ روز ہم تمہارے ساتھ رہیں گے۔''

''صرف ساتھ رہنے سے کام نہیں چلے گا۔''

''تو؟''

''آپ کو ہمارا رہن سہن اپنانا ہوگا۔ ہمارا پہناوا پہننا ہوگا۔''

''تمہارا پہناوا پہننا ہوگا؟'' اس کی نگاہیں چورسیا کی میلی کچیلی دھوتی پر مرکوز ہوگئیں۔ دھوتی کا میل اس کی پتلیوں میں چبھنے لگا۔

اِس رنگ کو اپنے ذہن سے جھٹک دو۔ اور جی کڑا کر کے یہاں رہنے اور اُن لوگوں میں بسنے کا من بناؤ'' اس کے اندر کی آواز نے اسے جوش دلایا۔

''پہن لیں گے۔'' اُس نے مضبوط لہجے میں اسے جواب دیا۔

''ہمارا کھانا کھانا ہوگا۔''

''تمہارا کھانا بھی کھائیں گے۔''

''ہماری طرح سونا ہوگا۔''

''سوئیں گے۔''

''ہم جو کام کرتے ہیں، کرنا پڑے گا۔''

''کام بھی کرنا پڑے گا؟''

''اور کیا، کام بھی کرنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے، کام بھی کریں گے۔''

''تو آپ ہماری طرح بن جایئے۔''

''لو، بن جاتے ہیں۔''

''آپ اپنے یہ کپڑے اُتاریئے۔''

''اُتار دیں گے، پہلے تم اپنا کوئی کپڑا تو لا دو۔''

''سوکھیا! ارے او سوکھیا! تنک گھر سے ایک دھوتی تو لانا۔''

''ابھی لایا کاکا۔'' ایک میلی کچیلی دھوتی آ گئی۔''

''لیجیے صاحب! اِسے پہن لیجیے۔''

دھوتی ہاتھ میں لیتے ہی بدبو کا ایک بھبکا اس کے نتھنوں میں سما گیا۔ اس کا چہرہ یک بارگی بگڑ گیا۔

''برج موہن! بدبو جھیلنے کی عادت ڈالو۔ ٹھیک کرو چہرے کو۔''

اندر سے آواز اُٹھی اور اُس نے بدبو برداشت کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

''کپڑے کہاں بدلیں؟''

''یہیں، اور کہاں۔''

''لیکن یہاں سب کے سامنے شرم نہیں آئے گی؟''

''صاحب اسے بھی اُتارنا پڑے گا۔ٹھیک ہے،فی الحال اُدھر آڑ میں جا کر بدل لیجیے۔''

''وہ دھوتی لے کر آڑ میں چلا گیا۔کپڑے بدل کر وہ چورسیا کے پاس آیا تو اسے دیکھ کر بچے کھلکھلا پڑے۔

''میلی دھوتی اور اُجلے بنیائن میں وہ سرکس کا جوکر دکھائی دے رہا تھا۔بچوں کے ہنسنے پر اسے غصہ تو بہت آیا مگر اس نے اپنے غصے پر قابو پالیا۔''

''لو،تمہارے کپڑے تو ہم نے پہن لیے،بولو،اب اور کیا کرنا ہے؟''

''اب چلیے کام پر چلتے ہیں۔''

''کہاں؟''

''جنگل میں۔''

''کس لیے؟''

''لکڑیاں توڑنے۔''

''لکڑیاں توڑنے؟''پہلے وہ چونکا،کچھ دیر تک خاموش رہا،پھر دھیرے سے بولا۔

''اچھا چلو۔''

بے راستے کے راستے پر چلتا ہوا تقریباً تیس چالیس منٹ بعد وہ چورسیا کے ساتھ جنگل پہنچا۔جنگل پہنچتے پہنچتے وہ پسینے میں شرابور ہو گیا۔دھوتی سے اس نے اپنے منھ کا پسینہ پونچھا اور ایک جگہ بیٹھ کر جنگل میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے لگا۔

''صاحب!میں تو اس پیڑ پر چڑھ رہا ہوں۔آپ بھی کسی پیڑ پر چڑھ جایئے۔''

''اچھا۔''اس نے اچھا تو کہہ دیا مگر پیڑ پر چڑھنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ پوری ہمت جُٹا کر وہ آگے بڑھا۔ایک پیڑ پر چڑھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ

ہوسکا۔ایک اور پیڑ پر ہمت آزمائی مگر جلد ہی پھسل کر نیچے آگرا۔

لگاتار وہ کئی پیڑوں کے پاس گیا، چڑھا، پھسلا، گرا۔آخر کار تیمور لنگ کی چیونٹی کی طرح ایک پیڑ پر چڑھنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

کافی احتیاط سے اس نے کچھ سوکھی لکڑیاں توڑیں اور اپنے کو گرنے سے بچاتا ہوا نیچے اُتار لیا۔

احتیاط کے باوجود اس کے ہاتھ پاؤں میں خراشیں آ گئی تھیں۔ایک ہاتھ لہولہان ہو گیا تھا۔

''صاحب! آپ تو گھائل ہو گئے ہیں۔لایئے آپ کے گھاؤ پر مٹی لگادوں۔'' اپنا گٹھر زمین پر رکھتے ہوئے چورسیا بولا۔

''مٹی!۔کیا کوئی دوا نہیں مل سکتی؟'' خوف آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا۔

''صاحب! دوا آس پاس میں کہاں ملے گی۔اس کے لیے بہت دور جانا پڑے گا۔تب تک آپ کے شریر کا آدھا خون بہہ جائے گا۔ڈریئے نہیں، میں مٹی کا لیپ لگا دیتا ہوں۔اِسی سے ٹھیک ہو جائے گا۔ہم تو یہی لگاتے ہیں۔''

''اچھا۔'' مجبوراً اس نے حامی بھری۔

اس کے زخم پر مٹی لگ گئی مگر وہ اندر ہی اندر ڈرتا رہا کہ کہیں ٹٹنس نہ ہو جائے۔اِس موقعے کے اُسے جتنے منتر یاد تھے، سب پڑھ ڈالے اور دل ہی دل میں بھگوان سے پرارتھنا کرتا رہا کہ وہ اُسے ٹٹنس سے بچالے۔

''صاحب! آج بس اِتنا ہی۔باقی کل۔اب گھر چلتے ہیں۔''

گھر کا نام سنتے ہی ایک کوٹھی اُس کی نگاہوں میں کھڑی ہو گئی، لان کے پھول اور دیواروں کے رنگ وروغن لہرانے لگے۔

چورسیا کے منع کرنے کے باوجود اپنی لکڑیوں کا گٹھر اس نے خود اُٹھایا اور راستے میں گرتا پڑتا جنگل سے بستی میں آ گیا۔

دونوں کے آگے دوپہر کا کھانا رکھ دیا گیا۔

دھبے دار اور جگہ جگہ سے پچکی ہوئی المونیم کی تھالی میں ایک عجیب طرح کا بھرتا اور موٹی، مٹ میلی ٹھیکرے جیسی سخت روٹی کو دیکھتے ہی اُس کی ناک بھوں سکڑ گئی۔ مگر پیٹ کی آگ اس کے ہاتھ کو روک نہ سکی۔

پہلے ہی لقمے میں اُس کا منھ بگڑ گیا۔ حلق تک پہنچتے ہی اول نے گلا پکڑ لیا۔ پانی کی طلب محسوس ہوئی لیکن پانی نے گلا اور دبا دیا۔ اس نے صرف سوکھی روٹی سے پیٹ بھرا۔ روٹی سے اس کا تالو بھی چھل گیا۔

''کیا روز یہی بھوجن ملے گا؟'' سختی سے روکنے کے باوجود یہ سوال اس کے لبوں سے باہر آ گیا۔

''نہیں، دوسرے پرکار کا کھانا بھی ملے گا'' چورسیا نے ہمدردانہ لہجے میں جواب دیا۔

کھانا کھا کر وہ ایک ڈھیلی ڈھالی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اول کی جلن تو کچھ کم ہوگئی تھی مگر تالو کی تکلیف اب بھی برقرار تھی۔

باجرے کی روٹی کسی دھاردار ناخن اور نکیلے دانتوں والے راکشش کی طرح اس کے سامنے منڈلانے لگی۔

روٹی میں چھپے نیش و نشتر سے تنگ آ کر اس کی نگاہیں اپنے گھر کی ڈائننگ ٹیبل پر پہنچ گئیں۔

پراٹھے، ٹوسٹ مکھن، میٹ مچھلی، دودھ دہی، پھل سبزی، جام جیلی اس کا استقبال کرنے لگے۔

ایک وقت کے کھانے میں گھر یاد آ گیا۔ اُنھیں دیکھو! یہ کھانا نہ جانے کب سے یہ چپ چاپ کھاتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے حلق اور تالوؤں کی تکلیف کا اندازہ لگاؤ! کب سے وہ جل رہے ہیں؟ کب سے وہ چھل رہے ہیں؟

اُس کے اندرون کی آوازنے اسے اپنے گھر کی ڈائننگ ٹیبل سے واپس کھینچ لیا۔اوراس کا ذہن اپنے جسم سے نکل کر بستی والوں کے حلق میں پہنچ گیا۔

رات کا کھانا آیا تو چور سیا بولا۔

''صاحب!اس وقت اچھا سالن پکا ہے۔''

''کیا پکا ہے؟''

''مانس پکا ہے۔''

''مانس کہاں سے لائے ہو؟''

''ایک ڈانگر مرا تھا۔اس کا مانس لائے ہیں۔''

''مرے ہوئے ڈانگر کا مانس؟''

''جی صاحب۔''

''کیا تم لوگ مردار بھی کھاتے ہو؟''

''ہاں صاحب!۔اور آپ لوگ؟''

''نہیں،ہم نہیں کھاتے۔''

''کیوں صاحب؟''

''مردار کھانا منع ہے۔''

''ہمیں تو کسی نے بتایا ہی نہیں صاحب۔ٹھیک ہے،ہم آپ کے لیے رگڑا پسوا دیتے ہیں۔''

''رگڑا کیا؟''

''مرچ اور لہسن کی چٹنی۔''

''او۔ٹھیک ہے چلے گا۔''

اس کے لیے مانس کی جگہ رگڑا آ گیا۔رگڑے کے ساتھ اس نے بڑی مشکل سے ایک روٹی کھائی اور ڈھیر سارا پانی پی کر اس کوٹھری میں چلا گیا،جہاں اس کے سونے کا بندوبست

کیا گیا تھا۔

کوٹھری میں گھستے ہی سیلن اور مٹی کے تیل کی بدبو نے اسے بے چین کر دیا۔ بستر کے نام پر وہاں مونج کے بانوں والی ایک چارپائی پڑی تھی، وہ اسی ننگی چارپائی پر لیٹ گیا۔

کچھ دیر بعد مچھروں کی فوج نے اُس پر یلغار کر دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے فوج برسوں کی بھوکی پیاسی ہو۔ زہر میں بجھے تیر و تبر اس کے جسم میں چبھ چبھ کر ٹوٹنے لگے۔ ایک طرف سے جنگ کی وہ ہولناکیاں جھیل ہی رہا تھا کہ دوسری طرف سے بھی حملہ شروع ہو گیا۔ اُس کی پیٹھ جلنے لگی۔ جیسے کسی نے اُس میں آگ کے گولے داغ دیے ہوں۔

ٹارچ جلا کر دیکھا تو بے شمار موٹے موٹے کھٹمل اس کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ اُس نے بھی جوابی کارروائی شروع کر دی۔ اُس کے دونوں ہاتھ خون کے دھبّوں سے بھر گئے۔

کھٹمل کو مسل کر وہ پھر سے لیٹ گیا۔ مگر جلد ہی چارپائی کی خفیہ چھاؤنیوں سے فوج کی ٹکڑیاں نکل کر پھر سے میدان میں آ گئیں۔

مچھروں اور کھٹملوں کے ڈنک نے اُسے چارپائی سے زمین پر اُتار دیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کس طرح رات بتائے۔ وہ کوٹھری سے باہر آ کر ٹہلنے لگا۔

اچانک اُس کی آنکھوں میں اُس کا بیڈ روم کھل گیا۔ ڈنلپ کے گدّے، پھول دار ریشمی چادر، نرم ملائم تکیے، پرفیوم کی خوشبو، اور خوبصورت شریک سفر کا لمس اس کی تکلیف میں اور اضافہ کرنے لگے۔

دفعتاً ایک گاؤن اُس کی آنکھوں میں لہرا گیا۔

کم سے کم گاؤن ہی پہن لیا جائے کچھ تو بچاؤ ہو سکے گا۔ یہ سوچ کر وہ کوٹھری کی طرف لوٹنے لگا۔

کسی نے دیکھ لیا تو؟

اِس وقت کون دیکھے گا؟ صبح لوگوں کے اُٹھنے سے پہلے ہی وہ اِسے سوٹ کیس میں رکھ دے گا۔

وہ سوٹ کیس کے پاس پہنچ کر اُسے کھولنے لگا کہ اُس کے اندر کی آواز پھر گونج پڑی۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟ مانا کہ دوسرے نہیں دیکھ رہے ہیں مگر تم تو دیکھ رہے ہو؟ کیا اِتنی جلد ہار گئے؟ تم تو یہاں کی زندگی جاننے چلے تھے۔ اُن کے دکھ درد کو قریب سے دیکھنے اور اُنہیں محسوس کرنے کے لیے رُکے تھے؟ چورسیا صحیح کہہ رہا تھا کہ تم اس کے جیون پر نہیں لکھ سکتے۔ تم کشٹ نہیں جھیل سکتے۔ جاؤ! چلے جاؤ! بھاگ جاؤ!''

''نہیں۔'' سناٹے میں نہیں کی آواز دور تک گونج پڑی۔ اس کا ہاتھ ٹھٹھک گیا۔ چابی تالے میں گھومنے کے بجائے باہر نکل آئی۔

وہ سیلن اور تیل کی بدبو سے بھری کوٹھری میں ننگی چارپائی پر پھر سے لیٹ گیا۔ رات بھر مچھر اور کھٹمل اس پر جارحانہ وار کرتے رہے اور وہ اپنے تخلیقی جوش و خروش کے بل بوتے پر ان کے ڈنک اور ٹیس کو سہتا رہا۔

صبح جب چورسیا اس سے ملنے آیا تو وہ اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''صاحب، آپ کے شریر پر تو مچھروں نے بُری طرح گودنا گود دیا ہے۔''

چورسیا کے بتانے پر جب اس نے اپنے آپ کو دیکھا تو اُسے محسوس ہوا جیسے راتوں رات اس کے جسم پر چیچک نکل آئی ہو۔

''صاحب آپ بے کار میں اپنا جیون خراب کر رہے ہیں۔ آپ واپس چلے جایئے ورنہ ہمارے ساتھ رہ کر آپ کا بھی ——''

''نہیں نہیں، میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں رُکوں گا۔ حالات کا مقابلہ کروں گا۔ اور جس مقصد کے لیے آیا ہوں، اُسے ضرور پورا کروں گا۔''

''ٹھیک ہے۔آپ کی مرضی،نہانا چاہیں تو وہاں جا کر نہا لیجیے۔''چور سیانے ایک چھوٹے سے پوکھر کی طرف اشارہ کیا۔

اُس نے اُدھر دیکھا تو اُس کی نظریں شرم سے جھک گئیں۔وہاں بہت سی عورتیں بھی ننگی نہا رہی تھیں۔

''صاحب! آنکھ جھکانے سے کام نہیں چلے گا۔یہاں رہنا ہے تو وہیں نہانا پڑے گا۔اُنھیں کے ساتھ جس طرح وہ دوسرے مرد نہا رہے ہیں۔اور ہاں،اور بھی بہت کچھ دیکھنا پڑے گا۔''

اُس نے آہستہ آہستہ نظریں اوپر اُٹھا کر پھر سے تالاب کی جانب مبذول کر دیں۔

اُس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

اُس کی طرف کچھ عورتوں نے بھی دیکھا مگر ان کے چہروں پر اس قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔

اُس کے پاؤں دھیرے دھیرے تالاب کی طرف بڑھنے لگے۔قریب پہنچ کر دیکھا تو اس چھچھلے تالاب میں بہت سارے جانور بھی لوٹ لگا رہے تھے۔

پانی کے رنگ اور بدبو کے بھبکے نے اسے پیچھے ڈھکیل دیا مگر کچھ دیر بعد اس کے پاؤں پھر آگے بڑھ گئے اور بڑھتے چلے گئے۔

رفتہ رفتہ اس نے خود کو اس ماحول میں ڈھال لیا۔صرف گندے پانی ہی میں نہیں بلکہ اس نے اپنے آپ کو وہاں کی گھناؤنی زندگی کی گہرائی میں بھی اُتار لیا۔

کچھ ہی دنوں میں اس کے گورے رنگ پر سیاہی کی پرت چڑھ گئی۔اس کے گال پچک گئے۔آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔چہرہ دھوپ میں جل کر کالا پڑ گیا۔ہاتھ پاؤں میں جگہ جگہ زخم کے نشان بن گئے۔

اس کا حلیہ اس حد تک بدل گیا کہ اسے خود کو پہچاننا مشکل ہو گیا مگر اسے خوشی تھی

کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب رہا۔اس نے وہاں وہ سب کچھ دیکھ لیا جو دیکھنا چاہتا تھا۔

وہاں سے لوٹ کر وہ تخلیقی عمل میں مصروف ہو گیا اور ایک دن اس نے اپنے مشاہدات، تجربات اور محسوسات کو تخلیق کے قالب میں ڈھال کر اسے چھپنے کے لیے سب سے اہم رسالے کو بھیج دیا۔اسے یقین تھا کہ اس کی یہ تخلیق شاہ کار ثابت ہوگی اور چاروں طرف دھوم مچا دے گی مگر اس کی وہ تخلیق شائع نہ ہو سکی۔ رسالے کے مدیر نے یہ لکھ کر لوٹا دی کہ:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رچنا کافی محنت سے رچی گئی ہے۔ رچنا کار نے فنکاری بھی خوب دکھائی ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ رچنا ہماری میگزین کے معیار پر پوری نہیں اُتری۔اس لیے کہ یہ آج کے زمانے کا ساتھ نہیں دیتی۔یہ سائبر اسپیس میں فٹ نہیں ہوتی۔''

مدیر کا خط پڑھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔اور اس کے ذہن میں چورسیا کا ایک جملہ گونجنے لگا۔''یہاں کی آتما آپ کو دکھائی دے گی صاحب؟''

سانڈ

''یہ کیسی بھگدڑ مچی ہے بھائی؟''

سورج پور گاؤں کے ایک بوڑھے نے اپنے برآمدے سے بھاگنے والوں کو مخاطب کیا

—ایک نوجوان نے رُک کر ہانپتے ہوئے جواب دیا۔''

''چاچا! گاؤں میں آج سانڈ پھر گھس آیا ہے۔''

''سانڈ پھر گھس آیا ہے!''بوڑھے کی سفید لمبی داڑھی اوپر سے نیچے تک ہل اٹھی—

''ہاں چاچا! پھر گھس آیا ہے اور آج تو اس نے ایسی تباہی مچائی ہے کہ پوچھیے مت۔ نتھو کی بچھیا کو خراب کر دیا۔ چھیدی کے بچھڑے کو سینگ مار دیا۔ بھولو کے بیل کو ٹکریں مار مار کر لہولہان کر دیا۔ کالو کی گائے بھینس کے چارہ پانی کے برتن کو توڑ پھوڑ دیا۔ بدھو اور بھولا کی تیار سبزیوں کو نوچ کھسوٹ کر ملیامیٹ کر دیا۔ اب بھی بورایا ہوا اینڈتا پھر رہا ہے۔ نہ جانے اور کیا کیا کرے گا؟ کس کس پر قیامت ڈھائے گا؟''

''تم لوگ دھام پور والوں سے کہتے کیوں نہیں کہ وہ اپنے سانڈ کو روکیں۔ ادھر نہ آنے دیں۔''

''کہا تھا چاچا! گاؤں کے بہت سے لوگوں نے مل کر کہا تھا۔ ان سے بتایا تھا کہ ان کے گاؤں کا سانڈ ہمارا کتنا نقصان کر رہا ہے۔ مگر جانتے ہیں اُنھوں نے کیا جواب دیا۔''

''کیا جواب دیا؟''

''اُنھوں نے یہ جواب دیا کہ بھلا سانڈ کو بھی کہیں روک کر رکھا جا سکتا ہے۔ سانڈ تو دیوی دیوتا کا پرساد ہوتا ہے۔ اسے بھگوان کے نام پر چھوڑا جاتا ہے اور بھگوان کے نام کا سانڈ بھگوان کی بنائی ہوئی اس دنیا میں کہیں بھی بنا روک ٹوک جا سکتا ہے۔ بھگوان ہی کی طرح اس کا بھی سب پہ حق ہے۔ سب میں اس کا حصہ ہے۔ وہ جو چاہے کھا سکتا ہے۔ اسے روک کر اپنے کو بھگوان کی نظروں میں دوشی اور نرک کا بھوگی بنانا ہے کیا ——؟ چاچا! میری سمجھ میں نہیں آیا کہ دھام پور کے لوگوں نے ایسا کیوں کہا؟ کیا سچ مچ سانڈ بھگوان کے نام پر چھوڑا جاتا ہے؟''

''ہاں بیٹے! بات تو سچ ہے۔ لوگ اپنی کسی مراد کو پانے کے لیے بھگوان یا دیوی دیوتا سے منت مانتے ہیں کہ اگر ان کی مراد پوری ہوگئی تو وہ بھگوان یا دیوی دیوتا کے نام کا کوئی سانڈ چھوڑ دیں گے اور اپنی گائے کے بچھڑے کو یا کسی دوسری گائے کے بچھڑے کو خرید کر آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ چھوڑنے سے پہلے اس بچھڑے کو خوب مل مل کر نہلاتے ہیں۔ اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتے ہیں۔ گاؤں والوں کو ایک جگہ جمع کر کے پُوجا پاٹ کرتے ہیں اور سب کے سامنے بچھڑے کے جسم یا ماتھے پر بھگوان یا دیوی، دیوتا کا کوئی پکا نشان بنا دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بچھڑے کو کھونٹے سے کھول کر آزاد کر دیتے ہیں۔

چونکہ وہ بھگوان کے نام پر چھوڑا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے کھانے پینے اور گھومنے پھرنے میں کوئی کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ڈالتا اور وہ آزادی اور بے فکری سے خوب کھا پی کر بہت جلد بچھڑے سے سانڈ بن جاتا ہے۔''

''پھر تو دھام پور والوں نے ٹھیک ہی کہا تھا چاچا؟''

''ٹھیک تو کہا تھا، مگر یہ بھی تو ٹھیک ہے کہ کوئی اپنی بربادی کو چپ چاپ نہیں دیکھ سکتا۔ اپنے بچاؤ کے لیے اسے بھی تو کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔''

''تو اب ہمیں کیا کرنا چاہیے چاچا؟''

''تم لوگ کانجی ہاؤس کے افسروں سے ملو۔ گاؤں کا حال بتاؤ۔ اوران سے کہو کہ وہ دھام پور گاؤں کے سانڈ سے ہمارے گاؤں کو تباہ ہونے سے بچائیں۔ ان سے یہ بھی کہو کہ یہ سانڈ پاگل ہوگیا ہے۔ اس لیے اسے جلد سے جلد کانجی ہاؤس میں بند کردیا جائے۔ ورنہ ہمارے گاؤں کے ساتھ ساتھ دوسرے گاؤں کو بھی روند ڈالے گا۔''

''ٹھیک ہے چاچا! میں آج ہی گاؤں والوں کو تیار کرتا ہوں۔''

سورج پور والے اپنی تباہی کی خبر اور سانڈ کی شکایت لے کر کانجی ہاؤس پہنچے۔

کانجی ہاؤس کے افسرِ اعلیٰ نے ان کا دکھڑا سن کر کہا۔

''آپ لوگوں کی تکلیف سن کر ہمیں بہت دُکھ ہوا۔ مگر افسوس کہ اس سلسلے میں ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔''

''کیوں صاحب؟'' گاؤں والے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''اس لیے کہ اس کانجی ہاؤس میں لاوارث سانڈ کو بند کرنے کا چلن نہیں ہے۔ یہاں تو ایسے جانوروں کو بند کیا جاتا ہے جن کا کوئی نہ کوئی وارث ہوتا ہے۔ جو کچھ دنوں کے اندر اندر اپنے جانوروں کو جرمانہ بھر کر چھڑا کر لے جاتا ہے۔ اگر ہم ایسے جانوروں کو باندھ کر رکھنے لگے تو کچھ دنوں میں یہ ہاؤس ہی بند ہو جائے گا۔'' اس نے نہایت ہی نرم لہجے میں جواب دیا۔

افسر کا جواب سن کر گاؤں والے گڑگڑا کر بولے'

''صاحب! کچھ کیجیے۔'' ورنہ تو ہمارا ستیاناس ہو جائے گا۔ ہم کنگال ہو جائیں گے۔''

افسر نے انہیں سمجھاتے ہوئے پھر کہا۔

''ہم مجبور ہیں۔ ہم ایسے جانور کو کانجی ہاؤس میں بالکل نہیں رکھتے۔ آپ لوگوں کو میری بات پر شاید یقین نہیں آرہا ہے۔ آیئے میرے ساتھ۔''

افسر گاؤں والوں کو اپنے ساتھ لے کر کانجی ہاؤس میں داخل ہوا۔

گاؤں والوں کی نگاہیں وہاں پر بندھے ہوئے جانوروں کو گھورنے لگیں۔ انہیں کہیں بھی کوئی سانڈ نہیں ملا۔ وہاں تو ایسے جانور بندھے تھے جو بہت ہی کمزور اور دبلے پتلے تھے جن کے پیٹ اندر کو دھنسے ہوئے تھے اور پسلیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔

کانجی ہاؤس کے اندر کا حال دیکھ کر گاؤں والے واپس لوٹ آئے اور اپنے کو قسمت کے حوالے کر کے بیٹھ گئے۔

ایک دن سانڈ نے گاؤں میں پھر تباہی مچائی۔ اس کے بعد ایک بار اور گھس آیا۔ پریشان ہو کر گاؤں والے ایک جگہ جمع ہوئے۔ بوڑھے نے گاؤں والوں کو اس بار یہ مشورہ دیا کہ وہ کانجی ہاؤس کے اوپر والے محکمے میں جا کر اپنی فریاد سنائیں۔ گاؤں والے وہاں بھی پہنچے۔ وہاں کے افسروں نے گاؤں والوں کی درخواست پر سنجیدگی سے غور کیا اور کانجی ہاؤس کے افسران کو زور دے کر لکھا کہ وہ دھام پور والوں کو سانڈ کی تباہی سے بچائیں اور گاؤں والوں سے کہا کہ وہ کانجی ہاؤس کے افسران سے رجوع کریں۔ وہ ضرور اس سلسلے میں ضروری کارروائی کریں گے۔

گاؤں والے پھر کانجی ہاؤس پہنچے۔ افسران نے ان سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ لوگ سانڈ کو پکڑ کر لائیے۔ ہم اسے یہاں بند کر لیں گے۔''

گاؤں والے کانجی ہاؤس کے افسر کی بات سن کر بہت خوش ہوئے اور گاؤں آ کر انہوں نے سانڈ کو پکڑنے کی تیاری شروع کر دی۔

گاؤں کے مضبوط اور پھرتیلے نوجوان ہر طرح سے تیار ہو کر سانڈ کا انتظار کرنے لگے۔ جلد ہی موقع ہاتھ آ گیا۔ سانڈ کے گاؤں میں گھستے ہی نوجوانوں کی ٹولی اپنے ہاتھوں میں لاٹھی اور رسّی لے کر اس کے پیچھے دوڑ پڑی۔

نوجوانوں نے سانڈ کو گھیرنے اور اسے گرا کر پکڑنے میں بڑی ہوشیاری دکھائی۔ اَن تھک محنت کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ سانڈ ان کے نرغے سے نکل بھاگا۔ اس کوشش میں بہت سے نوجوان زخمی بھی ہو گئے۔ مگر نوجوانوں نے بھی ہمت نہیں ہاری۔ وہ اس کا پیچھا کرتے رہے۔

وہ سانڈ سورج پور گاؤں سے نکل کر اپنے گاؤں یعنی دھام پور کی طرف بھاگا۔ نوجوان بھی اس کے پیچھے دوڑے۔

دھام پور والوں نے جب یہ دیکھا کہ کچھ لوگ ان کے سانڈ کو دوڑا رہے ہیں اور دوڑانے والوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور رسّیاں بھی ہیں تو وہ اپنے سانڈ کو بچانے کے لیے اپنے گھروں سے لاٹھی، بھالے اور بندوقیں لیے باہر نکل آئے اور پیچھا کرنے والوں کو للکارتے ہوئے چلائے۔

''خبردار! وہیں رک جاؤ! آگے مت بڑھو۔ اگر تم نے ہمارے سانڈ کو ہاتھ بھی لگایا تو ہم تمہارے ہاتھ توڑ ڈالیں گے۔ تمھیں گولیوں سے بھون دیں گے۔ یہیں زمین پر ڈھیر کر کے رکھ دیں گے۔ جانتے نہیں، یہ سانڈ ہمارے دیوتا پر چڑھایا گیا پرساد ہے۔''

سانڈ کا پیچھا کرنے والے سورج پور کے نوجوانوں نے جب دھام پور والوں کی دھمکی سنی اور ان کے ہاتھوں میں لہراتے ہوئے بھالوں، لاٹھیوں اور تنی ہوئی بندوقوں کو دیکھا تو ان کے پاؤں تھرا کر تھم گئے اور وہ آگے بڑھنے کے بجائے منھ لٹکائے ہوئے پیچھے پلٹ آئے۔

اس حادثے کے بعد دھام پور والے اور شیر ہو گئے۔ اور اب وہ اپنے سانڈ کو آئے دن جان بوجھ کر سورج پور گاؤں کی طرف ہانکنے لگے۔

سورج پور گاؤں کی تباہیاں جب حد سے زیادہ بڑھ گئیں تو ایک دن بوڑھے نے گاؤں کے چھوٹے بڑے سبھی کو بلا کر کہا۔

''میرے گاؤں کے پیارے لوگو! ہم نے ہر طرح کی کوشش کر کے دیکھ لی مگر سانڈ سے اپنے گاؤں کو نہ بچا سکے اور یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اگر ہم سانڈ کو پکڑنے کے لیے زیادہ کچھ کریں گے تو اس کی مدد کے لیے دھام پور والے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ نتیجے میں بھاری خون خرابہ ہوگا اور تباہی مچے گی۔ اس لیے اب ایک ہی راستہ بچتا ہے کہ ہم لوگ بھی اپنے دیوتا کے نام پر ایک بچھڑا چھوڑ دیں اور جلد سے جلد اسے سانڈ بنا دیں۔''

''اس سے کیا ہوگا چاچا؟''—— کئی نوجوان ایک ساتھ بول پڑے۔ان کی حیران آنکھیں بوڑھے کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔

''اس سے یہ ہوگا کہ ہمارا سانڈ بھی دھام پوروالوں کا وہی حال کرنے لگے گا جو اپنے سانڈ سے وہ ہمارا کرواتے ہیں۔اُدھر بھی جب تباہی مچے گی تب ان کی آنکھیں کھلیں گی اور وہ اپنے سانڈ کو روکنے پر مجبور ہوں گے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں چاچا۔یہ راستہ ہی ان کے لیے ٹھیک ہے۔'' نوجوانوں کے چہرے انتقام کی آگ سے دہک اٹھے۔مگر بعض بزرگوں کے چہروں پر سنجیدگی طاری ہوگئی۔

سورج پور والوں نے ایک بچھڑا خریدا اسے نہلایا دھلایا۔ گلے میں ہار پہنایا اور سب کے سامنے اس کی پیٹھ پر دیوتا کے نام کا ایک ٹھپہ لگا کر اسے آزاد چھوڑ دیا۔

کمزور بچھڑا کھونٹے سے الگ ہوتے ہی آزادی اور بے فکری سی کھانے پینے اور پروان چڑھنے لگا اور سارے گاؤں کا چارہ پانی کھا پی کر بہت جلد بچھڑے سے سانڈ بن گیا۔

سانڈ بن کر جب اس نے اینڈنا اور سینگ مارنا شروع کیا تو سورج پور والوں نے اس کا رخ دھام پور والوں کی طرف موڑ دیا۔ دھام پور گاؤں میں گھس کر اس نے گاؤں کو روندنا اور تہس نہس کرنا شروع کر دیا۔ وہاں بھی بیل لہولہان ہونے لگے۔ان کے چارہ، پانی کے برتن بھی ٹوٹنے پھوٹنے لگے۔ان کے کھیت اور کھلیان بھی تباہ و برباد ہونے لگے۔

دونوں طرف سے سانڈ ایک دوسرے کی جانب ہانکے جانے لگے۔ کچھ دنوں بعد ایک روز ایک عجیب وغریب منظر رونما ہوا۔ دونوں سانڈوں کو لوگوں نے ایک ساتھ گھومتے ہوئے دیکھا۔ دونوں اینڈتے ہوئے پہلے سورج پور گاؤں میں گھسے اور دونوں نے مل کر گاؤں کو روند روند کر ملیا میٹ کیا۔ پھر وہاں سے ایک ساتھ نکلے اور دھام پور میں گھس کر توڑ پھوڑ مچانے لگے۔

یہ منظر دیکھ کر دونوں گاؤں والوں کی آنکھیں حیرت میں ڈوب گئیں۔

اس دن کے بعد دونوں سانڈوں کا ایک ساتھ گھومنا اور مل جل کر گاؤں کو روندنا معمول بن گیا۔ دونوں گاؤں کے علاوہ آس پاس کے دوسرے گاؤں بھی ان سانڈوں کی چپیٹ میں آنے لگے۔

اپنی بربادی سے تنگ آ کر آس پاس کے سبھی گاؤں والے مل جل کر سانڈوں کو مارنے کا منصوبہ بنانے لگے مگر کسی طرح یہ خبر محکمۂ تحفظِ وحشیان تک پہنچ گئی اور اس نے ان سانڈوں کی پیٹھ پر اپنا ٹھپہ لگا دیا جو اس بات کا اعلان تھا کہ یہ جانور محکمۂ تحفظِ وحشیان کی حفاظت میں ہیں۔ انہیں کوئی بھی مار پیٹ نہیں سکتا۔

لوگوں نے یہ دیکھ کر سانڈوں کو مارنے پیٹنے کے بجائے اپنا اپنا سر پیٹ لیا۔

ہاؤس ہوسٹس

ایرکنڈیشنڈ آفس میں ایزی چیئر پر بھی مسٹر چوپڑا دباؤ اور تناؤ لیے بیٹھے تھے۔ وہ ایک سی قسم کے بواسیر میں مبتلا تھے۔ مسئے ان کے دماغ میں تھے۔ جس دن مسئے زیادہ پھول جاتے مسوں میں ہل چل سی مچ جاتی اور دباؤ سے چہرے کا تناؤ بڑھ جاتا۔

آفیسر بیگ میز پر کب سے تیار پڑا تھا مگر وہ اسے اُٹھا نہیں پا رہے تھے، جیسے اس میں کسی نے آتش گیر مادہ رکھ دیا ہو۔ آتش گیر مادہ تو اس میں نہیں تھا مگر گھر جا کر جب بھی وہ بیگ رات میں کھلتا تو دھماکا ضرور ہو جاتا۔ کاغذوں کے پھیلتے ہی گھر میں بھونچال آ جاتا۔ ماحول کی دھجیاں بکھر جاتیں۔ در و دیوار میں دھواں بھر جاتا۔ یہ اور بات ہے کہ گھر کے بھونچال، ماحول کے بکھراؤ اور در و دیوار کے دھویں کا سبب صرف یہ بیگ ہی نہیں تھا بلکہ گھر کے اردگرد آئے دن کھلنے والے وہ بکسیز بھی تھے جن سے نکلنے والا تیز رنگوں اور بوؤں کا بارودی غبار کھڑکیوں، دروازوں اور روشن دانوں سے گھس کر دل و دماغ پر چڑھتا اور سانسوں میں بستا جا رہا تھا۔ کچھ اور چیزیں بھی تھیں جو باہری دباؤ کے باعث اندر سے اٹھ رہی تھیں اور ان سب سے گھر کا توازن بگڑتا جا رہا تھا۔

گھر کے بگڑے ہوئے توازن سے نکلنے والی بے ہنگم، کرخت اور بے رس آوازیں حسبِ معمول مسز چوپڑا کے کانوں میں ادھم مچا رہی تھیں اور توازن کے اس بگاڑ سے بننے والی بدرنگ بے کیف اور بدہیئت صورتیں آنکھوں میں بچھوؤں کی طرح اپنا

ڈنک چبھو رہی تھیں۔

مسٹر چوپڑا کے مشتعل مسّوں کا ایک علاج سنکائی ضرور تھا جس کا انہیں تجربہ بھی تھا۔ وہ کسی بار یا کیبرے میں چلے جاتے۔ شراب کا نشہ انہیں سن کر دیتا یا کیبرے ڈانسر کے عریاں بدن سے نکلنے والی گرمی دماغ کے مسّوں کو گرما کر نرم بنا دیتی۔ کولھوں کے جھٹکوں سے انہیں آرام مل جاتا مگر گھر پہنچتے ہی سوئے ہوئے مسّے اپنی آنکھیں کھول دیتے۔

جب بھی تناؤ بڑھتا مسٹر چوپڑا کا ذہن ادھر ادھر بھٹکتا ہوا اپنی فیکٹری کے بنے کھلونوں پر آ کر رک جاتا۔ ان کے سامنے طرح طرح کے کھلونے گھومنے لگتے۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہوتے جو روتے بچّوں کو ہنسا دیتے، ضدی بچّوں کی ضد کو دبا دیتے، ان کا دھیان ایک طرف سے دوسری جانب موڑ دیتے، اپنے کرتب سے بچّوں کے پیٹ میں گدگدیاں بھر دیتے۔ پژمردہ چہروں پر شادابیاں سجا دیتے۔ ویران آنکھوں میں چراغ جلا دیتے۔

آج بھی ان کا ذہن کھلونوں پر آ کر رک گیا تھا۔

کھلونوں کے سامنے بچّوں کی جگہ جوان اور بوڑھے کھڑے تھے، جن کی ویران آنکھیں، کھنچے ہوئے چہرے، خشک ہونٹ، پرشکن پیشانی، سخت سپاٹ پیٹ، سب کے سب کھلونوں کی سمت ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔

''سر ابھی تک ــــ'' مسٹر چوپڑا آواز پر چونک پڑے۔ سامنے ان کے مینجر ملہوترا کھڑے تھے۔

''ہاں مگر آپ! مسٹر چوپڑا نے ملہوترا کی طرف تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر آپ کو ایک خوش خبری سنانی ہے۔''

''سنایئے۔''

''آپ کے خوابوں کی تعبیر مل گئی سر!''

''کون سے خواب؟ کیسی تعبیر؟'' مسٹر چوپڑا کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''سر ہم نے ہاؤس ہوسٹس تلاش کر لی ہے۔''

ہاؤس ہوسٹس؟

''یس سر!''

مسٹر چوپڑا کے ذہن میں ہوائی جہاز اڑنے لگے۔ آس پاس خلائی دوشیزائیں سجی سنوری مہکتی اور مسکراتی ہوئی پھرنے لگیں۔ شگفتہ جسموں کی تازگی دل و دماغ کو تر و تازہ کرنے لگی۔

سفر کی گرد چھٹنے لگی۔ تناؤ ڈھیلا پڑنے لگا۔ کاروباری اُلجھنوں، گھریلو جھمیلوں، سودوزیاں کی جھنجھٹوں اور جھنجھلاہٹوں سے مکتی ملنے لگی۔ ماضی کی تلخیوں پر پردہ پڑ گیا۔ مستقبل کی چنتاؤں پر غلاف چڑھ گیا۔ حال ہوا کی طرح ہلکا ہو گیا۔

''کیا سچ مچ ہاؤس ہوسٹس مل گئی؟''

''یس سر!''

''کیا یہ ہاؤس ہوسٹس بھی ویسی ہی ہوگی جیسی کہ جہازوں میں ہوتی ہیں جو پورے سفر میں ہر ایک مسافر کی شریک حیات بنی رہتی ہیں، جن سے بنا ضرورت بولنے کو جی چاہتا ہے۔ بنا بھوک پیاس کے بھی جن سے کھانے پینے کی چیزوں کی فرمائش کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ جنھیں ہر کوئی اپنی آنکھوں میں قید کر لینا چاہتا ہے۔ جن کی بدولت ہوائی جہاز کا سفر ہوا کی طرح سبک ہو جاتا ہے؟

''سر ان سے بھی بہتر ہے ہماری ہاؤس ہوسٹس۔''

کیا؟'' آنکھوں کے ساتھ مسٹر چوپڑا کے ہونٹ بھی پھیل گئے۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں سر! آپ کے خوابوں کی تعبیر کی تلاش میں ہم کئی ہوائی میزبانوں کے گھر بھی گئے مگر گھروں کے اندر ان کے جسموں پر ہوائی جہاز والا رنگ و نور نظر نہ آیا۔ ان کا چہرہ پھیکا، باسی اور بوسیدہ لگا۔ ان سے بات کرتے وقت ان کے لہجوں میں جھنجھلاہٹ اور اکھڑپن بھی محسوس ہوا۔ سر! ہم نے جو ہاؤس ہوسٹس حاصل کی ہے اس کا

رنگ وروپ ہمیشہ تروتازہ رہے گا۔اس کا لب ولہجہ بھی سدا پرسکون اور پرکیف بنا رہے گا۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔''

''یقین آجائے گا! جب آپ اسے دیکھیں گے۔''

''میں جلد سے جلد دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''میں تو اسی لیے حاضر ہوا ہوں سر۔''

مسٹر چوپڑا اسپرنگ کی طرح اچھل کر اپنی کرسی سے اترے اور ملہوترا کے پیچھے پیچھے اپنی فیکٹری کے گیسٹ ہاؤس تک پہنچ گئے۔ملہوترا نے آگے بڑھ کر کال بٹن کو دبادیا۔بٹن کے دبتے ہی دروازہ کھل گیا۔

ایک نہایت حسین وجمیل دوشیزہ نے جاں بخش مسکراہٹ سے استقبال کیا۔مسٹر چوپڑا کی نگاہیں دوشیزہ کے مقناطیسی رنگ وروپ پر کسی کمزور لوہے کی طرح فوراً چپک گئیں۔ متناسب، سڈول،شگفتہ،شاداب اور پرآب جسم نے مسٹر چوپڑا کے پژمردہ اور ویران آنکھوں کے آگے رنگ ونور بکھیر دیے۔

چند لمحے بعد اس حسنِ مجسم کے لب لعلیں بھی کھل گئے۔

''یہ کیا؟ آپ نے پھر چہرے کو تناؤ سے بھرلیا؟ میں کہتی ہوں آخر اتنی سوچ فکر کیوں؟ یہ بھاگ دوڑ کس لیے؟—— زندگی مسکرانے کے لیے ملی ہے،اُداس ہونے کے لیے نہیں۔میں اس چہرے پر پھول دیکھنا چاہتی ہوں،خار نہیں۔آیئے گرم پانی تیار ہے،منہ ہاتھ دھولیجیے،کچھ ریلیف مل جائے گا۔''

مسٹر چوپڑا حیرت واستعجاب سے اس حسینہ کی طرف دیکھتے ہوئے باتھ روم کی جانب بڑھ گئے۔اس کی آواز کا جادو اور لہجے کی اعتمادی قوت نے انہیں واش بیسن تک پہنچادیا۔باتھ روم سے باہر نکلے تو وہ پھران کے پاس آگئی۔

''کیالیں گے؟ چائے ،کافی؟ یا کوئی سافٹ ڈرنک؟ کہیئے تو وہسکی کا ایک پیگ بنادوں؟''

مسٹر چوپڑا اس کی آنکھوں کے پرخلوص بھاؤ اور باتوں کے مترنم بہاؤ میں بہنے لگے۔ چہرے کا کھنچاؤ کم ہونے لگا۔ بوجھل من سبک ہونے لگا جیسے ان کے مسّوں کو ٹھنڈک پہنچ گئی ہو۔

''سر! اب ذرا اس کا ایک دوسرا رول دیکھیے۔ ملہوترا نے ایک اسکول بوائے کو بلوایا جو اپنی پیٹھ پر کتابوں کا بستہ لادے ایک دوسرے کمرے میں تیار بیٹھا تھا۔ بچہ اشارہ پاکر دروازے کی طرف بڑھا۔ پیچھے پیچھے دروازے تک ہاؤس ہوسٹس بھی پہنچ گئی۔

''دیکھو بیٹے! ٹھیک سے اسکول جانا۔ راستے میں کہیں اِدھر اُدھر نہ رکنا۔ چھٹی ہونے پر سیدھے گھر پہنچنا۔ لنچ ٹائم میں لنچ ضرور کھالینا۔ بھولنا نہیں۔ پیاس لگے تو پانی صرف اپنی بوتل کا پینا۔ اور سنو ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے بچے کی پیشانی پر ایک پیار بھرا بوسہ ثبت کر دیا۔

بچہ لمسِ محبت سے سرشار ہو کر جھومتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ہاؤس ہوسٹس کے ہونٹوں سے چھلکتی ہوئی ممتا مسٹر چوپڑا کے من کے پیالے میں بھر گئی۔ ان کا سراپا معصوم بچے کی طرح مسکرا اُٹھا۔

''سر ایک اور روپ ملاحظہ فرمایئے۔'' ملہوترا نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد کال بیل بجی اور ہاؤس ہوسٹس دروازے پر پہنچ گئی۔ دروازہ کھلا۔ سامان سے لدی پھندی ایک عورت اندر داخل ہوئی۔

''میم صاحب! شاپنگ کیسی رہی؟ لگتا ہے آپ بہت تھک گئی ہیں۔ بیٹھیے پہلے میں آپ کے لیے گرما گرم کافی لاتی ہوں۔ پھر آپ کے جسم کا مساج کر دوں گی۔ آپ پھر سے فریش ہو جائیں گی۔''

''کیسی لگی سر؟''

''بہت اچھی۔ بہت ہی پیاری۔ ایک دم فنٹاسٹک!''

''تھینک یو سر!''

''مگر ملہوترا!''

''سر؟''

''گھر کے اندر جا کر کہیں یہ بھی ایر ہوسٹس کی طرح باسی اور پھیکی تو نہیں ہو جائے گی۔''

''بالکل نہیں سر! ذرا اسے غور سے تو دیکھیے۔ اس کی جلد میں جو کساؤ ہے وہ کبھی ڈھیلا نہیں پڑے گا۔ اور اس کا رنگ تو اتنا پختہ ہے کہ کسی بھی موسم کا وار اسے پھیکا نہیں کر سکتا۔ اور اس کے لب و لہجے میں ایسی جاذبیت ہے کہ قیامت تک بھی ختم نہیں ہوگی۔''

''تو کیا یہ ——؟'' حیرت سے مسٹر چوپڑا ملہوترا کی طرف دیکھنے لگے۔

''یس سر!''

''ونڈرفل! میں تو سمجھ رہا تھا کہ —— بھئی ملہوترا م نے واقعی کمال کر دیا۔ آئی ایم پراؤڈ آف یو۔''

''سر! کمال تو اس کا ہے جو اس کے اندر ہے۔ جو اتنا sensative ہے کہ پیروں کی چاپ سے سمجھ جاتا ہے کہ آنے یا جانے والا مرد ہے یا عورت ہے۔ جوان ہے یا بوڑھا ہے۔ یا بچہ ہے۔ جو یہ بھی محسوس کر لیتا ہے کہ کوئی آ رہا ہے یا جا رہا ہے۔ جسے وقت کا بھی احساس رہتا ہے اور جو جنس، عمر، وقت، حیثیت، موقع، ماحول، موسم سب کو نگاہ میں رکھتا ہے اور اسی کے مطابق اپنا رول پلے کرتا ہے۔''

''واہ ملہوترا واہ! آج پتہ چلا کہ تم ایک کامیاب بزنس مین اور اچھے سائنس داں ہی نہیں بلکہ ایک عظیم تخلیق کار بھی ہو۔ سچ مچ تم نے میرے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ نکالی ہے۔ اب جلد سے جلد یہ تخلیق میرے گھر پہنچ جانی چاہیے۔

''سر! لیکن ایک درخواست ہے''

''بولو''

''سر ہم اس کی نمائش کرنا چاہتے ہیں اگر آپ اجازت دیں تو۔''

''مسٹر چوپڑا سوچ میں پڑ گئے'' کچھ دیر کے بعد بولے۔

''ٹھیک ہے مگر نمائش میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔''

''بالکل دیر نہیں ہوگی سر!''

بہت جلد نمائش کی تیاریاں مکمل کر لی گئیں۔ ہاؤس ہوسٹس نمائش کے لیے شہر کے سب سے بڑی آرٹ گیلری میں رکھی گئی۔ دیکھنے والوں کا تانتا لگ گیا۔ ہاؤس ہوسٹس کے مختلف طرزوں اور روپ کا مظاہرہ دیکھ کر لوگ دنگ رہ گئے۔

نمائش کے بعد ملہوترا نے ایک موٹا سا رجسٹر مسٹر چوپڑا کے سامنے رکھ دیا۔

یہ کیا ہے؟

''سر! اس میں لوگوں کے کمنٹس Comments ہیں۔''

مسٹر چوپڑا نے رجسٹر کھول کر اِدھر اُدھر سے پڑھنا شروع کیا۔

''آپ کی فیکٹری نے یہ ایک ایسا جاندار کھلونا بنایا ہے جو بے جان جسموں میں بھی جان ڈال دیتا ہے اور جو بچہ، بوڑھا، جوان، مرد، عورت سب کے لیے کشش رکھتا ہے۔

(رپورٹر)

''اس تخلیق کو دیکھ کر میری طرح بہت سے، ادیب تخلیق کرنا بھول جائیں گے۔''

(ادیب)

''آپ اسے بیچنا چاہیں تو میں اس کے منہ مانگے دام دے سکتا ہوں۔''

(تاجر)

''روبوٹ سائنس کی ایک بہت بڑی دین ہے مگر اس میں خوبصورتی پیدا نہیں کی جا سکی۔ آپ نے اس ماڈل کو حسن عطا کر کے سائنس کو بہت آگے بڑھا دیا ہے۔

(سائنس داں)

''آپ اسے میرے گھر پہنچا دیجیے۔ بدلے میں جو چاہے کرا لیجیے'' (منسٹر)

''مجھے یہ اتنی اچھی لگی کہ میں اپنے ممی پاپا کو بھی بھول گئی۔'' (طالبہ)

''میں ایک کم تنخواہ والا ملازم ہوں۔ اسے خرید نہیں سکتا۔ اس لیے جی چاہتا ہے

اسے چرا کر اپنے گھر لے جاؤں۔" (ٹیچر)

"نوکری اگر نہیں، تو یہ ہاؤس ہوسٹس ہی مجھے دے دی جائے۔"

(بے روزگار)

"یہ تو اتنی قیمتی ہے کہ اگر اس کی اسمگلنگ کی جائے تو ہیرا، سونا، چرس، حشیش، افیون، براؤن شوگر سب پر پانی پھر سکتا ہے۔ (اسمگلر)

"اتنی پیاری چیز کو آپ نے یہاں بند کر رکھا ہے۔ اسے گھر لائیے نا۔"

مسز اوشا ملہوترا، وائف آف ایم۔ آر۔ ملہوترا
مینجر ٹوائز کمپنی

مِسنگ مَین

ہمارے اپنے مکان کی دیواروں پر میری پسند کا رنگ ابھی چڑھنا شروع ہی ہوا تھا کہ اسے دیکھ کر میرے بچّوں کی ناک بھوں سکڑ گئی۔

بیٹا بولا، ''پاپا! یہ کیسا رنگ کرا رہے ہیں؟ پلیز اسے روک دیجیے۔''

''ہاں، پاپا! یہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ مؤیا کوئی اور نیا کلر کرائیے۔''

بیٹی بھی بول پڑی۔

''کیوں؟'' اس رنگ میں کیا خرابی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

پاپا، یہ بہت ڈل اور بھدا لگ رہا ہے۔ اس سے تو مکان کی بیوٹی ہی خراب ہو جائے گی۔'' بیٹے نے خرابیاں گنوائیں۔

''ہاں پاپا! سنی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ بہت ہی بے کار کلر ہے۔'' بیٹی نے تائید کی۔

''نہیں، نہیں یہ رنگ اچھا ہے۔ یہی ٹھیک رہے گا۔''

''کیا پاپا! آپ کا ٹیسٹ کیسا ہے؟ دیکھئے یہ بالکل نہیں جچ رہا ہے۔ پلیز اسے روک دیجیے۔'' بیٹا زور دینے لگا۔

''فار گوڈ سیک پاپا۔ اسے نہ کرائیے۔'' بیٹی بھی دباؤ ڈالنے لگی۔

''نہیں، یہی ٹھیک رہے گا۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔'' میں اپنے فیصلے پر اڑنے لگا۔

''پاپا آپ تو ضد کرنے لگے۔'' بیٹا بولا۔

''yes، آپ ضد کر رہے ہیں پاپا!'' بہن نے بھائی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''ہاں، میں ضد کر رہا ہوں، میں ضدی ہوں اور اب وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔''

میرا لہجہ سخت ہوگیا۔

بچے مایوس ہوکر اندر چلے گئے۔

''آپ ضد کر رہے ہیں۔''

یہ جملہ زہر میں بجھے تیر کی طرح میرے احساس میں پیوست ہوگیا۔ مرا وجود جھنجھنا اُٹھا۔

یکا یک بہت سارے مناظر میری آنکھوں کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ میں نے اپنی حیثیت کے مطابق مکان کا پلاٹ اقرار کالونی میں لینا چاہا مگر اسے سرسید نگر جیسے مہنگے علاقے میں خریدنا پڑا۔

میں نے سفید رنگ کی ماروتی پسند کی مگر گھر میں سٹیل گرے کلر کی سنٹرو آگئی۔

میں بچوں کو یونیورسٹی کے اسکول میں داخل کرنا چاہتا تھا مگر وہ لیڈی فاطمہ میں داخل ہوگئے۔

ان سب میں ان کی مرضی موجود تھی۔ یہی نہیں بلکہ ٹی وی، فرج، صوفہ، پلنگ ایک ایک چیز میں ان کی مرضی شامل تھی اُن کی ضد چھپی ہوئی تھی۔

پھر بھی کہتے ہے، میں ضد کرتا ہوں، کہاں ہے میری ضد؟ کدھر ہے میری مرضی؟''

میں اپنی ضد اور اپنی مرضی تلاش کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ان کی ماں گھر سے باہر نکلی اور میرے پاس آکر آہستہ سے بولی۔

''کیوں بچوں کا موڈ خراب کر رہے ہیں؟ ان کی بات کیوں نہیں مان لیتے؟ آخر اس مکان میں رہنا تو انہیں کو ہے۔ ہم اب اور کتنے دنوں کے مہمان ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم اپنی پسند ان پر لادیں۔ دونوں نئے مکان کو لے کر کتنے پر جوش تھے، کتنے خوش تھے۔ مگر آپ کی ضد نے ان کے جوش وخروش، ان کی خوشی ومسرت سب پر پانی پھیر دیا۔ بے چارے اُداس وملول بیٹھے ہیں۔ آپ نے یہ بھی سوچا کہ ان کی پڑھائی پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ یہ رنگ کا چکر ان کی پڑھائی میں ضرور بھنگ ڈال دے گا۔ خدا کے لیے مان جایئے۔ مہربانی کر کے کام کو رکوا دیجیے۔

بیوی نے ہمیشہ کی طرح والدین کا فرض اور بال ہٹ کا فلسفہ سمجھا کر اور ان کی پڑھائی کا واسطہ دے کر مجھے خاموش کر دیا۔

میں نے کبھی نہیں چاہا کہ میرے بچّے اُداس ہو جائیں۔ ان کے چہرے کا رنگ اُڑ جائے۔ اُن کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ جائے۔ ان کے دلوں میں یاس بھر جائے۔

اُن کی اُداسی کا ذکر سنتے ہی اُن کے اُداس چہرے میری آنکھوں میں آ بسے۔

''ٹھیک ہے۔ تم لوگوں کی جو مرضی ہو، کرو، اب میں کچھ نہیں بولوں گا۔''

ہمیشہ کی طرح یہ جملہ دہرا کر میں خاموش ہو گیا۔

بیوی خوش اور مطمئن ہو کر بچّوں کو خوشخبری سُنانے چلی گئی اور میں حسبِ عادت اپنے ماضی میں پہنچ گیا۔ مجھے اپنا بچپن یاد آنے لگا۔

''ابا! ابا!۔''

''کیا ابا ابا کی رَٹ لگا رکھی ہے، کچھ بولتا کیوں نہیں؟''

''ابا میں گاؤں کے مدرسے میں نہیں پڑھوں گا۔ میں شہر کے مشن اسکول میں جاؤں گا۔''

''کیا کہا! تو تم مدرسے میں نہیں پڑھے گا۔ مشن اسکول میں جا کر کرسٹان بنے گا!''

خبردار جو دوبارہ وہاں جانے کی بات کی تو ——

یکا یک میرے ہونٹ سِل گئے۔ میرا منہ لٹک گیا۔ میری آنکھوں کی چمک بجھ گئی۔

''ابا! ابا!۔''

''پھر ابا! ابا! تجھ سے کتنی بار کہا کہ تو تو تلایا مت کر۔ سیدھی بات کیا کر۔''

''جی ابا۔''

''بول کیا کہنا چاہتا ہے؟''

''ابا میں رنگین سائیکل لوں گا۔ نیلی ہینڈل اور لال فریم والی، جس کے پہیے پتلے پتلے ہوتے ہیں۔''

''نہیں ہرکلس ٹھیک رہے گی۔ وہ مضبوط ہوتی ہے۔''

''نہیں، میں تو وہی لوں گا۔''

''میں نے کہہ دیا نا کہ ہرکلس سائیکل آئے گی۔

''نہیں، میں ہرکلس نہیں لوں گا۔ مجھے تو رنگین سائیکل چاہیے۔''

چٹاخ۔

''لے یہ رہی رنگین سائیکل۔ دوبارہ ضد کی تو یہ تیرے گال مار مار کر اور لال کر دوں گا۔''

میں روتا ہوا وہاں سے اُٹھ کر اپنی کوٹھری میں چلا گیا اور دیر تک لکھوری اینٹوں والی کوٹھری میں سسکتا رہا۔

رہ رہ کر میرے دل میں یہ خیال آتا رہا کہ ابا میرے پاس آئیں گے اور میرے آنسو پونچھیں گے۔ مجھے پچکاریں گے۔ مگر ابا نہیں آئے۔ یہ خیال شاید اس لیے آتا رہا کہ ایک بار جب میں بیمار پڑا تھا تو ابا ساری رات میرے پاس بیٹھے رہے۔ میرے ماتھے پر پانی کی پٹی رکھتے رہے، مجھے تسلی دیتے رہے۔

میں کچھ بڑا ہوا تب بھی میری بات نہیں سنی گئی۔ میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پڑھنا چاہا مگر ابا نے مجھے بہار یونیورسٹی میں داخل کر دیا۔

میں نے اپنی پسند کی ایک لڑکی سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تو جواب میں ابا کہ چنگیزی لب و لہجے میں نادر نامہ آدھمکا۔

ماضی کی یاد نے مجھے اور رنجیدہ کر دیا۔ میری اُداسی اور گہری ہوگئی، میری آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔

''آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ بچوں کی خواہش کو پورا کرنا تو ماں باپ کا فرض ہوتا ہے۔ ان کی ضد کے آگے تو والدین کو جھکنا ہی پڑتا ہے۔ آخر اولاد کی خوشی میں ہی تو ماں باپ کی خوشی ہے۔ اس میں بھلا پریشان اور اُداس ہونے کی کیا بات ہے——''

مجھے محسوس ہوا جیسے میری بیوی میرے سرہانے کھڑی مجھے سمجھا رہی ہو مگر وہ تو کچن کے کام میں مصروف تھی۔

میرے جی میں آیا کہ میں دیکھوں کی میری اُداسی کا کوئی اثر میرے بچوں پر ہے یا نہیں اور میں اپنے کمرے سے اُٹھ کر اُن کے کمرے میں چلا گیا۔

دونوں بچے ٹیلی ویژن پر کوئی مزاحیہ سیریل دیکھنے میں محو تھے۔ میرے آنے کا انہوں نے نوٹس بھی نہیں لیا۔

میں اکثر اپنے بچوں کو خوش کرنے میں اُداس ہوا۔ اُن کی ضد پوری کرنے میں میرا دل دُکھا۔ میری انا مجروح ہوئی۔ میرے اندر شدید خواہش جاگی کہ بچوں کو میرے اندر کی کیفیت کا

احساس ہو۔ وہ مجھ سے میری اُداسی کا سبب پوچھیں۔ افسوس کا اظہار کریں مگر وہ ہر بار اپنی ضد کی کامیابی کی خوشی میں مجھے بھول گئے۔

میں خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ کچھ دیر تک میں چپ چاپ کمرے کی چھت کو گھورتا رہا، پھر کمرے سے نکل کر باہر چلا گیا۔

رنگائی کا رکا ہوا کام پھر سے شروع ہو چکا تھا۔ دیوار پر کوئی اور رنگ چڑھ رہا تھا اور وہ نیا رنگ پہلے والے رنگ کو مدھم کرتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر تک میں ایک رنگ کو ہلکا اور دوسرے کو گاڑھا ہوتا ہوا دیکھتا رہا۔

پھر باہر سے اندر آ گیا۔ بچے حسب معمول سیریل میں مصروف تھے۔ بیوی کچن میں مگن تھی۔ میں اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر لیٹ گیا۔

دیوار سے دونوں رنگ اُتر کر میری آنکھوں میں داخل ہو گئے۔

دونوں رنگ جگنوؤں کی طرح آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔ اچانک میرے دیدوں میں میرا مکان اُبھرنے لگا۔

پہلے نیو اُبھری۔

نیو سے میری ضرورتیں بھی اُبھریں جنھیں دفن کر کے نیو کھودی گئی تھی۔ نیو کے بعد دیواریں اُبھریں۔

دیوراوں سے میری وہ خواہشیں بھی اُبھریں جنہیں دبا کر دیواریں اُٹھائی گئی تھیں۔

پھر چھت اُبھری۔

چھت سے وہ قرض بھی اُبھرا جسے چھت تعمیر کرنے میں میں نے اپنے جسم و جان پر لاد لیا تھا۔

اور آخر میں وہ رنگ اُبھرا جسے دیواروں کے لیے میں نے پسند کیا تھا اور اِسی کے ساتھ وہ رنگ بھی اُبھر آیا جسے بچّوں کی ضد نے اُبھارا تھا اور جو دیوار سے اُتر کر میری آنکھوں میں داخل ہو کر اپنا رنگ دِکھا رہا تھا۔

نیو، دیواریں، چھت، تینوں کھسک کر کہیں اور چلی گئیں۔ آنکھوں میں صرف رنگ رہ گئے۔

رفتہ رفتہ ایک رنگ اُڑتا گیا پھیکا پڑتا گیا۔ اور دوسرا جمتا گیا اور گاڑھا ہوتا گیا۔

گاڑھے رنگ پر میری نگاہیں مرکوز ہو گئیں۔

یہ میرے بچّوں کا رنگ تھا جسے اُن کے بچپن کی ضد نے اُبھارا تھا، اس رنگ نے ایک بار پھر سے مجھے اپنے بچپن میں پہنچا دیا۔ میں اپنے ارد گرد اسے تلاش کرنے لگا مگر مجھ میں وہ کہیں نہیں ملا، مجھے تو وہ رنگ میرے ابّا کے پاس نظر آیا۔

میں مایوس اور اُداس ہو کر اپنے بچپن سے باہر نکل آیا۔ پھر وہیں آ گیا جہاں میں خود ابّا بنا بیٹھا تھا مگر یہاں بھی ابّا والا رنگ مجھ میں نہیں تھا۔ وہ رنگ تو میرے بچّوں کے پاس تھا۔

میں نہ وہاں تھا اور نہ یہاں۔

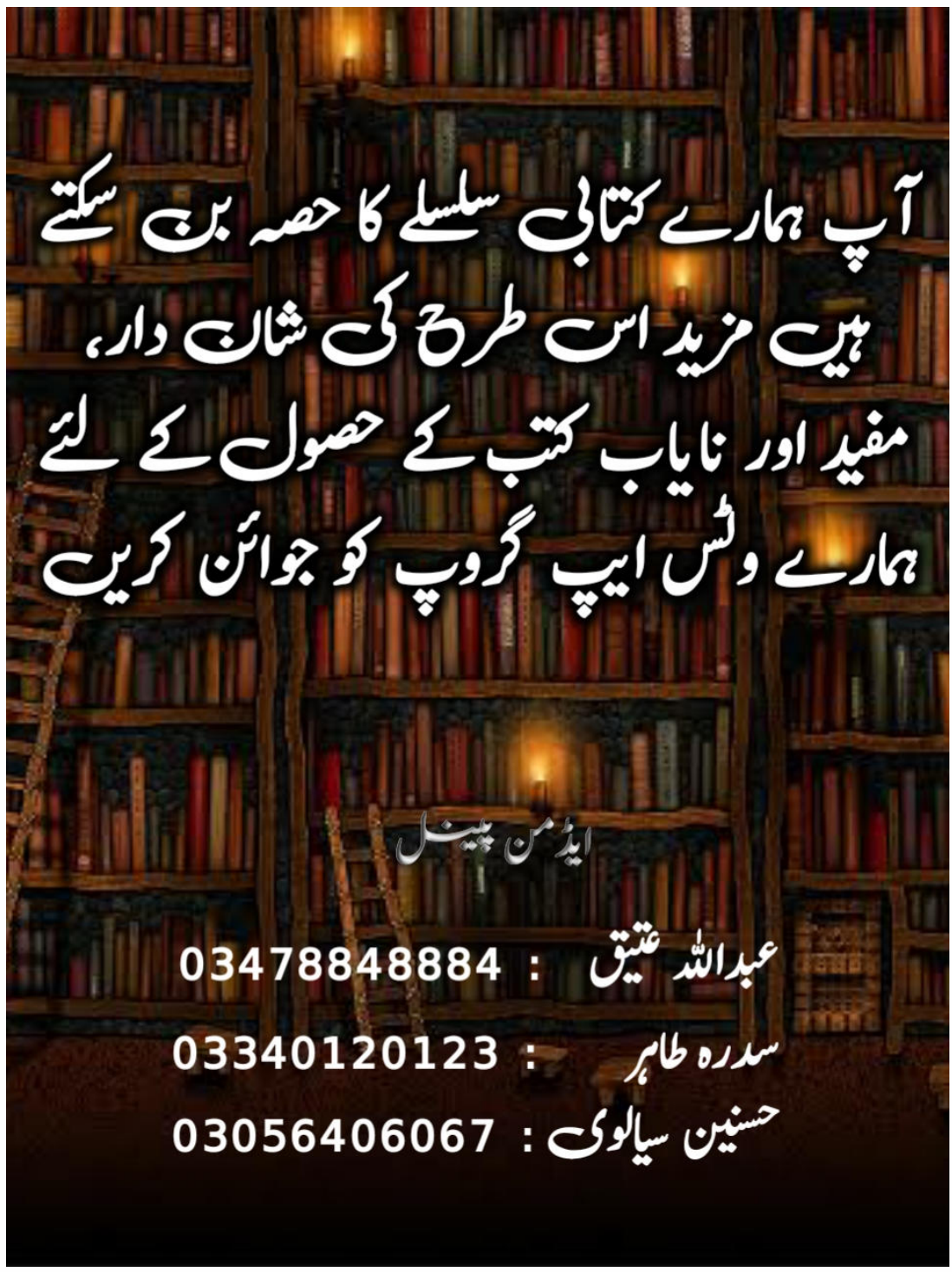

سوانحی کوائف

نام	غضنفر علی
قلمی نام	غضنفر
جائے پیدائش	چوراؤں، تھاوے، گوپال گنج، بہار
تعلیم	ایم۔اے (اردو) پی۔ایچ۔ڈی
پیشہ	سرکاری ملازمت
عہدہ	ڈائریکٹر، اکادمی برائے فروغ استعدادِ اردو میڈیم اساتذہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

تصانیف:

۱۔	کوئلے سے ہیرا	(ڈراما)	1971
۲۔	مشرقی معیارِ نقد	(تنقید)	1978
۳۔	پانی	(ناول)	1989
۴۔	کینچلی	(ناول)	1993
۵۔	کہانی انکل	(ناول)	1997
۶۔	دویہ بانی	(ناول)	2000
۷۔	زبان و ادب کے تدریسی پہلو	(تنقید)	2001
۸۔	فسوں	(ناول)	2003

۹۔ وش منتھن	(ناول)	2004
۱۰۔ تدریسِ شعروشاعری	(تنقید)	2005
۱۱۔ حیرت فروش	(افسانوی مجموعہ)	2005
۱۲۔ مم	(ناول)	2007
۱۳۔ لسانی کھیل	(درس وتدریس)	2007
۱۴۔ شوراب	(ناول)	2009
۱۵۔ سرخ رو	(خاکوں کا مجموعہ)	2010
۱۶۔ مانجھی	(ناول)	2012
۱۷۔ فکشن سے الگ	(تنقید)	2013
۱۸۔ روئے خوش رنگ	(خاکے)	2015
۱۹۔ آنکھ میں لکنت	شعری مجموعہ	2015
۲۰۔ سخن غنچہ	بچوں کی نظمیں	2015

کتابیں (ھندی میں):

دوسیہ بانی	(ناول)	نیراسدن، الہ آباد
کہانی انکل	(ناول)	وانی پرکاشن، نئی دہلی

زیر طبع تصانیف:

۱۔ شبلی نعمانی کے تنقیدی نظریات	(تحقیقی مقالہ)
۲۔ مثنوی کربِ جاں	(مثنوی)
۳۔ جدید طریقۂ تدریس	(درس وتدریس)
4۔ ناول پارے	(ناولوں کا مجموعہ)

رابطه :

- ڈائریکٹر/ پروفیسر غضنفر علی، اکادمی برائے فروغِ استعدادِ اردو میڈیم اساتذہ، نوم چومسکی کمپلیکس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔25
- بشریٰ، حمزہ کالونی، نزد اقرا کالونی، نیو سرسید نگر، علی گڑھ
- B-29 اسٹریٹ نمبر 7، شاہین باغ، ابوالفضل انکلو، فیز۔II، نئی دہلی، 25

فون نمبر:

موبائل : 09990237388

آفس : 011-26922601

گھر، علی گڑھ : 09411979684

09557417244

گھر، دہلی : 011-29948560